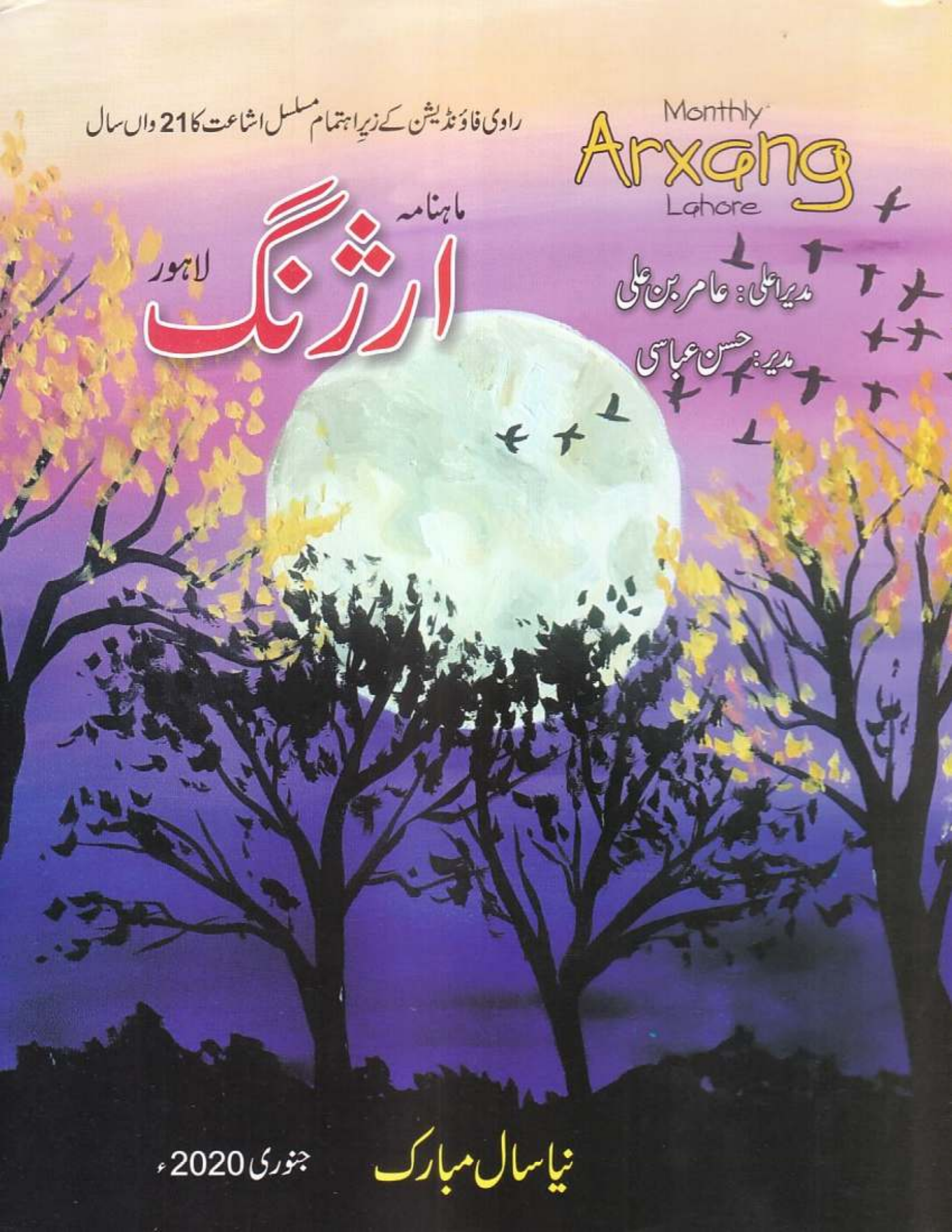
راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 21 واں سال
Monthly
Arxang
Lahore
ماہنامہ
ارژنگ
لاہور
مدیر اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی
نیا سال مبارک
جنوری 2020ء

شاعری کرنا، رائٹر بننا یہ بہت خاص کام ہے ہر کوئی نہیں کرتا

الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری ہوگئی ہے

منفرد شاعرہ، ادیبہ، مصنفہ کالم نویس

رخشندہ نوید

سے مدیر اعلیٰ ارژنگ معروف شاعر، کالم نگار، سفرنامہ نگار

عامر بن علی

کا مکالمہ

ارژنگ: سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے؟

رخشندہ نوید: بہت سارے بہن بھائیوں کی اکلوتی بہن، باذوق والد کی بیٹی اور والد کے پاس میں نے بہت ساری اردو فارسی کی کتابیں گھر میں دیکھیں بچپن میں۔ اور دھیرے دھیرے میں نے ان کتابوں کو چھوا، وہ مجھے پڑھنی نہیں آتی تھی، مگر مجھے اچھی لگتی تھیں۔ تو بہت سارے بہن بھائی تھے، بہت مزے کا گھر تھا۔ لیکن ان میں سے میں نے گھر کے چھوٹے سے کمرے پہ قبضہ کرلیا تھا۔ سکول کے زمانے میں کرلیا تھا۔ اور وہاں میں نے اپنی پسند کی کتابیں جو مجھے دیکھنے میں اچھی لگتی تھیں۔ جن کے ٹائیٹلز، جن کے کورز وہ سب میں نے جمع کر کے ایک ٹیبل پہ رکھی تھیں۔ اور تھوڑی میں منفرد ضرور تھی اپنے گھر سے۔ اپنے ماحول سے بھی آپ کہہ لیں، اپنے بہن بھائیوں سے بھی آپ کہہ لیں، مطلب یہ کہ میرے شوق عجیب ہی تھے۔ میں اب سوچتی کہ اگر میں شادی سے پہلے تک کی اگر میں باتیں کروں، پیدا ہونے، سکول کی، کالج و یونیورسٹی کی تو کچھ اور قسم کا میرا اسٹائل ضرور تھا۔ حتیٰ کی میرے بہن بھائی بچپن سے ہی میرے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنے آپ کو کچھ سمجھتی ہوں کہ یہ اپنے آپ کو میم سمجھتی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ اب اتنی عمر گزارنے کے باوجود بھی مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کسی بھی چیز سے۔ چونکہ میں ویسی کی ویسی ہوں۔ ماحول بھی بدلے، گھر بھی بدلے، ساری روٹین بھی بدلی، لیکن میں وہی کی وہی رہی۔ لاہور کالج سے پڑھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا۔ پنجاب یونیورسٹی تک آتے آتے میں کافی معروف شاعرہ ہوگئی تھی۔ ٹی وی میں بھی ایک دو پروگرام جو اینکسٹرز کے تھے میں انٹروڈیوس ہوگئی تھی۔ اور والد صاحب نے شائد دیکھ لیا تھا یا گیس کرلیا تھا کہ میرے اندر لکھنے کا کچھ کیڑا ان کو دکھائی دیا۔ تو انہوں نے باقی سب سے زیادہ مجھ پہ نظر کرم ضرور رکھی۔ جیسے وہ مجھ سے انگریزی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ پھر مجھے اقبال پڑھاتے تھے، ہمارے گھر میں بڑا خوبصورت لان تھا۔ سمن آباد میں میں کلاس سکس میں تھی تو وہاں ہمارے والد نے گھر خریدا تھا۔ بہت خوبصورت اور بہت پیارا گھر اور بہت خوبصورت لان والا گھر اس وقت ایک ڈریم ٹرو اتنا خوبصورت گھر کوئی بھی کہہ سکتا تھا۔ اس گھر میں بہت خوبصورت لان تھا۔ مجھے شاعر بنانے میں اس لان کا بہت ہاتھ ہے۔ اس میں اتنے خوبصورت پھول تھے کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ کہ میں گلاب اور موتیے کی پرات بھر بھر کر اتارا کرتی تھی۔ یہ میرا شوق تھا۔ ہر روز سکول جانے سے پہلے میں تھیلا بھر کر موتیے کا اتارتی اور پھر گجرے بھی بناتی اور پھولوں سے تو مجھے بہت پیار تھا۔ یہ تھوڑا سا ورثے میں ملا آپ کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے والد ہر موسم میں جو ہمارا مالی چاچا تھا اس سے بیل تبدیل کرواتے تھے موسم کے لحاظ سے۔ کہ اس موسم میں یہ بیل لگاؤ اس پہ یہ پھول آئیں گے تو رات کے وقت آم کا پیڑ تھا ہمارے لان میں اور بھی کچھ تھے۔ اس کے ہری لائیٹ لگا کر ایک شاور لگوا دیا تھا اس کے نیچے۔ پھر مجھے بھولتا نہیں کہ ہم سب بہن بھائی اس لان میں گرمیوں میں چارپائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے۔ اتنا مزے کا ٹائم تھا اور میرا پڑھنے کا کریس تھا وہ تب شروع ہوگیا تھا۔ کتابیں پڑھنا وہاں ہمارے سمن آباد میں ڈونگی گراؤنڈ ہے، منی مارکیٹ ہے۔ اس میں ایک لائبریری ورائیٹی جو کتابیں پڑھنے کے لئے دیتی تھی۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 21 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 21 جنوری 2020 شمارہ نمبر 1

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ لبنیٰ صفدر ◉ ابرار ندیم

{مجلس مشاورت}

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ • زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹو گرافر • نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس • محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 اراکا زری : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پرچہ کاپی اعزازی بھیج جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد / ، 2

نعت / ، 3

طنز و مزاح

○ ایوارڈ یافتہ لیرا / عطاء الحق قاسمی ، 4

مضامین:

○ جمیل یوسف ..... جل پری کے دیس میں/ کمال پاشا راز ، 6

○ امریتا پریتم کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ / آفتاب احمد ، 18

○ خالد مسعود کی بے ساختگی پر ایک نظر / ڈاکٹر نائلہ صدف ، 11

○ اُردو میں نکاحی شاعری / لبنیٰ صفدر ، 14

○ "اک دور محبت بیت گیا"۔ حرفِ اعتراف / مسلم شمیم 16

○ عبدالوحید بسمل۔ محبتوں کا شاعر (ایک پل) ، 19

شعری گوشے:

○ تبسم انوار، عماد اظہر ، 21 تا 22

افسانے

○ شیش محل جیسا بنگلہ / یونس جاوید ، 23

○ بیگم برلاس / بشریٰ رحمٰن ، 30

شاعری 37

○ انٹرویو: رخشندہ نوید ، 40

○ انٹرویو: حسنین سحر ، 50

مختصر ادبی خبریں ، 53

خطوط ، 54

Good Bye Plastic Bags Palwasha Safdar 1

★★★★★

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد

مرا لہجہ مری آواز تو ہے
مرے جینے کا ہر انداز تو ہے
گزرتی زندگی تیرا کرم ہے
مرے خالق مرا دم ساز تو ہے
میں اک مدت سے زیرِ آسماں ہوں
میں بے پر ہوں مری پرواز تو ہے
مرے نغموں کا جوہر تیرا احساس
مرے سوزِ نہاں کا ساز تو ہے
تری تخلیق ہوں معجز نما ہوں
مرے ہاتھوں کا سب اعجاز تو ہے
مری فطرت کی خوبی ہے تری یاد
مرے دل پر اثر انداز تو ہے
حقیقت پر تری پردہ ہے منصور
خدائے لم یزل کا راز تو ہے

مظفر حسن منصور

ہے سیدھا چلنا محال صاحب
ازل سے ٹیڑھی ہے چال صاحب
بگڑنا ہی تھا کہ آپ نے کب
ہماری کی دیکھ بھال صاحب
وہی پرانے جواب اُن کے
وہی پرانے سوال صاحب
سمندروں کا سمندروں سے
رہے گا کب تک وصال صاحب
کباڑ خانہ ترا سلامت
مرا بدن ریگ مال صاحب
ہماری آنکھوں میں آ گیا ہے
جو آئینے میں تھا بال صاحب
تمہارے گھر میں بھی غم زدوں کا
کسی نے پوچھا نہ حال صاحب
ہمارا ہونا نہ ہونے جیسا
ہمارا کیا انتقال صاحب
تمہارا ابرِ کرم جو برسے
جنوب بھی ہے شمال صاحب
تمہارے دربار میں کھڑے ہیں
اُٹھا کے شکووں کے تھال صاحب

حسن عباسی/لاہور

زمیں روشن، زماں روشن
ترے سارے جہاں روشن
وجودِ ضوفشاں تیرا
یہاں روشن، وہاں روشن
جدھر بھی دیکھیے تُو ہے
عیاں روشن، نہاں روشن
نظر اُٹھی تو دیکھا ہے
حرم کا ہر سماں روشن
ترے ہی نور کے باعث
ہوئے پیر و جواں روشن
ہیں سب شمس و قمر تیرے
ہے جن سے آسماں روشن
میں تیرا اسم پڑھتا ہوں
رہے میرا مکاں روشن
کہا اخلاق، جب اللہ
ہوئی میری زباں روشن

ڈاکٹر اخلاق گیلانی/لاہور

گر رہا ہوں مجھے سہارا دے
بحرِ ظلمت میں ہوں کنارا دے
جو کبھی ڈوبنے نہ پائے یہاں
میری قسمت کو وہ ستارا دے
ہے اندھیرا نہ ڈگمگا جاؤں
اے خدا آسرا خدارا دے
ڈھل نہ جائے حیاتی کا سورج
دید کو طیبہ کا نظارا دے
اپنے محبوبؐ کے نواسوںؑ کا
مجھ کو اُترن دے یا اُتارا دے
زندگی ہار جاؤں تیرے لیے
یہ منافع ہے یا خسارا دے
کیا ہے بہتر مجید کیا جانے
ہے مرے واسطے جو پیارا دے

عبدالمجید چٹھہ/لاہور

نعت

افلاک سے بھی ارفع مدینے کی زمیں ہے
کیا اس کے مقابل بھلا فردوس بریں ہے
قربان ہیں جس ذاتِ گرامی پہ دو عالم
وہ کون زمانے میں سوا اس کے حسیں ہے
وہ قطرۂ شبنم ہو کہ ہو ذرّۂ صحرا
چھو لے ترے نعلین کو وہ دُرِ ثمیں ہے
پہنچا ہو جو اک پل میں سرِ عرشِ معلیٰ
مرسل کوئی ایسا تو زمانے میں نہیں ہے
اے صاحب قرآن عنایت کی نظر ہو
تیرے لیے بے چین مرا قلب حزیں ہے
اس قلب کی عظمت کا بیاں کیسے ہو ممکن
وہ جس میں بسا گنبد خضریٰ کا مکیں ہے
جس دل کو بھی مل جائے ترے درد کی دولت
اس کے لیے پھر فتح مبیں فتح مبیں ہے
اُس در کا تفاخرؔ کو بھی دیدار ہوا ہے
جس در پہ جھکی رہتی ملائک کی جبیں ہے

تفاخر محمود گوندل

بات جو اصل ہے اس بات کے اندر کیا ہے
تجھ کو معلوم نہیں نعت کے اندر کیا ہے
شمس موڑا ہے کبھی توڑ کے جوڑا ہے قمر
کفر حیراں ہے اشارات کے اندر کیا ہے
ساتھ جب موئے مبارک کے ہے چہرہ دیکھا
تب سمجھ آیا کہ دن رات کے اندر کیا ہے
عقل حیرت میں ہے انگشت سے چشمے جاری
کوئی بتلائے کہ اس ہاتھ کے اندر کیا ہے
حسن سیرت کے دریچوں میں پڑھا شانِ نزول
پھر نظر آیا کہ آیات کے اندر کیا ہے
گر پسینہ نہیں سرکار کا واعظ تو بتا
پھر مہکتا ہوا باغات کے اندر کیا ہے
وہ جو حالات کٹھن ہجرت و میثاق کے تھے
نعت ساجدؔ تو لبوں پر ہی سجائے رکھنا
چھوڑ دنیا کے یہ نغمات کے اندر کیا ہے
آنکھ والا ہی تو جلوؤں کی حقیقت دیکھے
معجزات و کرامات کے اندر کیا ہے
تھا پتہ آپ کو حالات کے اندر کیا ہے

محمد امین ساجد سعیدی/ حاصل پور

بلندیوں کی تمنا ہو یہ گدائے رسولؐ
جو نقش ماتھے پے ہو جائے نقش پائے رسولؐ
بھلا کے وعدۂ آمد سزا سے بچنے کو
بروزِ حشر ہے لازم ہمیں ردائے رسولؐ
نجاتِ فکر جہنم کی ہیں سند وہ سبھی
ہمارے واسطے تحفے جو رب سے لائے رسولؐ
وہ جس سے راضی ہیں راضی خدا بھی ہے اُس سے
کہ رب کو پیاری ہے ہر حال میں رضائے رسولؐ
برس رہی ہیں ادھر بارشیں کرم کی سلیمؔ
جدھر بھی دیکھ کے ہلکا سا مسکرائے رسولؐ

عمران سلیم/ لاہور

ابتدا و انتہا پیارے نبیؐ
بے کسوں کا آسرا پیارے نبیؐ
ہے خدا اور مصطفیٰؐ کی ایک بات
کب خدا سے ہیں جدا پیارے نبیؐ
میرے دامن میں کمی کوئی نہیں
دے رہے ہیں بے بہا پیارے نبیؐ
راہِ حق سب کو دکھائی آپؐ نے
ہیں سبھی کے رہنما پیارے نبیؐ
دنیا و عقبیٰ کی ہر اک راہ میں
میرے سچے پیشوا پیارے نبیؐ
نامِ احمدؐ سے مصیبت ٹل گئی
ہیں مرے مشکل کشا پیارے نبیؐ
ہے غزالی گونج میرے چار سُو
مصطفیٰؐ، صل علیٰ پیارے نبیؐ

غزالی/ گوجرہ

زیست میں میری اُن کی سیرت کے ہوں خدوخال
میری زیست بھی بن جائے دنیا میں ایک مثال
میری سوچ کا مرکز محور ہو سیرتِ اُنؐ کی
لکھوں میں احوال انہی کا دے وہ حُسنِ خیال
میرے عمل کی نسبت میرے آقاؐ سے ہو بس
ہو جاؤں میں صرف انہی کا ہو جائے یہ کمال
اُمت کی پستی کے غم میں، میں ہی کڑھتا ہوں
سب کو اپنے اپنے گناہوں پر ہو کاش ملال
میری اذانیں اُن کے نام سے گونجیں پانچ پہر
اور مصیبت میں بن جائے اُن کا نام ہی ڈھال
خواب میں آئیں اور لحد میں ہو دیدار نصیب
آسیؔ کو حاصل ہو مولا ایسا لطف وصال

عدیل احمد آسی/ ڈنمارک

ایوارڈ یافتہ لٹیرا

عطاء الحق قاسمی/ لاہور

اس دفعہ لاہوریوں نے جس طرح بسنت منائی ہے، اس سے ان کے اپنے اگلے پچھلے ریکارڈ ٹوٹ گئے ہیں۔ بسنت نائٹ کو لاہور کی شاید ہی کوئی چھت ہو جہاں ایک ہنگامہ بپا نہ ہو، ہوٹلوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، شاہراہ قائداعظم کے دو ہوٹلوں کی پارکنگ کا دائرہ باہر سڑک تک پھیل گیا تھا اور گورنر ہاؤس تک کاریں ہی کاریں نظر آتی تھیں، بڑے گھروں اور ہوٹلوں کی چھتوں پر سرچ لائٹیں اور فل والیم کے ساتھ ڈیک آن تھے، گھروں میں مہمانوں کیلئے پکوان تیار ہو رہے تھے، چھتوں پر باربی کیو کا انتظام تھا چنانچہ گرم گرم کباب اور تکے پلیٹوں میں اتر رہے تھے، اس دن موٹروے کی بھی سنی گئی، چنانچہ اتنی کمائی شاید پورے سال میں نہ ہوئی ہو جتنی موٹروے نے اس ایک دن میں کر کے دکھا دی۔ لاہور کی سڑکوں پر جگہ جگہ پیلے کپڑوں اور پیلی پگڑیوں میں ملبوس ڈھول بجانے اور لڈی ڈالنے والے ''صاحبان ذوق'' کے منتظر بیٹھے تھے چنانچہ ان کے پاس کاریں آ کر رکتی تھیں اور انہیں پوری رات کیلئے بک کر کے ساتھ لے جاتی تھیں اس کے بعد ان چھتوں پر ڈھول بھی بجتے رہے، لڈیاں بھی پڑتی رہیں اور دوستوں کے سروں پر سے وار کے ہزاروں روپوں کی ویلیں بھی فضا میں اچھالی گئیں۔ صرف یہی نہیں بہت سی چھتوں پر مجرے بھی ہوئے اور اس مجرے کے ساتھ مجرے کے سارے لوازمات بھی شامل تھے اگر بڑے چھتوں پر بچوں کے ساتھ عشق پیچے بھی پڑتے رہے کہ محفلیں مخلوط تھیں!

اس بسنت کے موقع پر ''کھلاڑیوں'' نے فاؤل بھی بہت کیے، کچھ فاؤل تو وہ تھے جو ایسے مواقع پر ہمیشہ کیے جاتے ہیں لیکن اس دفعہ ایک نیا فاؤل بھی دیکھنے میں آیا۔ بسنت کی رات کو ایک اجنبی چھت سے ایک سیاہ رنگ کا گڈا اڑایا گیا اور اسے فضا میں بہت اونچائی تک لے جایا گیا، حتیٰ کہ رات کی سیاہی میں وہ دوسرے کھلاڑیوں کو نظر آنا بند ہو گیا۔ اونچائی پر مناسب ہوا کی موجودگی کی وجہ سے یہ گڈا پوری طرح اپنے ''تن'' میں تھا اور کسی کو نظر بھی نہیں آتا تھا چنانچہ وہ شب خون کے انداز میں ڈائی مار کر کسی کمزور اور ادھ اڑی پتنگ پر گرتا اور اسے کاٹ کے رکھ دیتا۔ جس کی پتنگ کٹتی تھی اسے پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ اس کی پتنگ کون کاٹ گیا ہے، چنانچہ اس دکھائی نہ دینے والے گڈے کی وجہ سے پتنگ بازوں میں خوف و ہراس اور دہشت کی وہ فضا پیدا ہوئی کہ کئی ماہر پتنگ بازوں نے اس انجانی آفت سے بچنے کیلئے اپنی پتنگیں اتار لیں، مگر کچھ دیر بعد اپنے ہی ''تن'' کی وجہ سے اس گڈے کی ڈور ٹوٹ گئی اور بسنت پر پھر سے بہار آ گئی۔

لاہور ہی میں ایک بسنت اس کے علاوہ بھی تھی جس میں نہ باجے گاجے تھے، نہ ہزاروں روپوں کی ڈوریں تھیں، نہ سینکڑوں مہمان مدعو تھے، نہ پکوان تیار ہو رہے تھے اور نہ ہی وہ شور شرابہ تھا جو چھتوں سے سنائی دیتا تھا یہ بسنت منانے والے اس شہر کے وہ غریب بچے اور نوجوان تھے جو اس بسنت کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے جو شہر کی بے شمار چھتوں پر منائی جا رہی تھی یہ لوگ گلیوں میں اور اپنے گھر کی مٹیوں پر ''ٹہا نگیاں'' اور ''گاٹیاں'' ہاتھ میں پکڑے آسمان پر نظریں جمائے کھڑے تھے اور ہر کٹی ہوئی پتنگ کو لوٹنے کیلئے اپنی جان خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ بیشتر اوقات پتنگ کسی کے حصے میں نہیں آتی تھی کہ محروم رہ جانے والا آگے بڑھ کر وہ پتنگ ہی پھاڑ دیتا تھا جو اس جیسے دوسرے محروم شخص کے ہاتھ میں آئی ہوئی تھی پتنگ کے ساتھ آنے والی ڈور کی ''گٹھیں'' کی جاتیں اور جب بہت ساری ''گٹھیں'' اکٹھی ہو جاتیں تو گانٹھ لگا لگا کر انہیں یکجا کیا جاتا اور پھر کاغذ کا گولا بنا کر اس کے گرد یہ لوٹی ہوئی ڈور جس میں جوڑ ہی جوڑ ہوتے تھے۔ لپیٹ دی جاتی اور پھر یہ ''پنا'' ہاتھ پکڑے کٹی پھٹی پتنگ کو پیوند لگا کر یہ لوگ اسے فضا میں بلند کرتے اور سمجھتے کہ وہ بھی بسنت منانے والے ہجوم کا حصہ ہیں لیکن چند ہی لمحوں بعد ان کی پتنگ جوڑ لگے ہوئے ڈور کی وجہ سے خود ہی ٹوٹ جاتی اور یا پھر کوئی چھ فٹ کا گڈا اس پر جھپٹتا اور اسے ''اڑیس'' کر اپنے ساتھ لے جاتا اور یہ لوگ ایک دفعہ پھر اپنی ''ٹہا نگیاں'' اور ''گاٹیاں'' پکڑے آسمان پر حسرت بھری نظریں جما دیتے۔

اس روز میں نے ایک منظر دیکھا جو میں بھول نہیں سکتا، ایک ٹانگوں سے معذور بچہ جسے اس کا ''مالک'' بھیک مانگنے کیلئے سڑک کے کنارے بٹھا گیا تھا لیکن اس روز اس کا دھیان پاس سے گزرتے ہوئے کسی ''سخی'' کی طرف نہیں تھا بلکہ آسمان پر اڑنے والی پتنگوں اور کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے بھاگنے والوں کی

طرف تھا۔ اس دوران ایک پتنگ کٹ کر اس سے ذرا فاصلے پر جا گری۔ اس معذور بچے کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک نمودار ہوئی جو جانے کتنے عرصے بعد اس کی آنکھوں میں آئی تھی، یہ اپنے جسم کو زمین پر گھسیٹتا ہوا اس پتنگ کی طرف بڑھا اور جب یہ پتنگ اس کے ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ گئی، ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور یہ پتنگ لوٹنے میں کامیاب ہو گیا معذور بچہ اسے بے بسی سے دیکھتا رہ گیا پتنگ لوٹنے والے بچے کی آنکھوں میں بھی خوشی کی وہی چمک تھی جو چند لمحے پیشتر معذور بچے کی آنکھوں میں پیدا ہوئی تھی۔ ہمارا نظام بھی عجیب نظام ہے ایک آنکھ کو خوشی دیتا ہے اور دوسری آنکھ کو آنسوؤں سے بھر جاتا ہے۔

بسنت کا جشن پورے کروفر سے منانے والے، کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے مارے مارے پھرنے والوں کو ''لٹیرے'' کا نام دیتے ہیں۔ میں آج سارا دن سوچتا رہا کہ اس دفعہ ریس کورس پارک میں سرکاری طور پر بسنت منانے والی حکومت نے ''لٹیرا 2000ء'' کے ایوارڈ کا اعلان کیا ہے اور اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت لاکھوں روپے بسنت پر خرچ کرنے والوں اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس خیرات میں بسنت منانے والوں میں سے کس طبقے کو لٹیرا قرار دیتی ہے اور پھر اس طبقے میں سے کس 'خوش نصیب'' کو ''لٹیرا 2000ء'' کے خطاب سے نوازتی ہے؟ مجھے اس ایوارڈ یافتہ لٹیرے کا انتظار رہے گا، ویسے اگر میں منصفین میں شامل ہوتا تو بسنت رات کو شب خون مارنے والے سیاہ گڈے کیلئے متذکرہ ایوارڈ سے الگ ایک خصوصی ایوارڈ کا اعلان ضرور کرتا!

(21 فروری 2000ء)

اک اور ہجرت

کتنا خالی تھا میرا کمرہ
یہ یاد ہے
جب پچھلی ہجرت کے بعد
ہم اس مکاں میں آئے
تو کتنا خالی تھا میرا کمرہ
بہت سی یادوں، کئی کتابوں
پرانے کپڑوں کیلنڈروں سے

مرا یہ کمرہ جو بھر چلا تھا
تو لگ رہا ہے
کہ اب تو اس کو بھی چھوڑ جانے میں کچھ ہی دن ہیں
کسی نئے شہر کی طرف جانے والے
رستے بلا رہے ہیں
چلو کہ اب وقت آ گیا ہے
اب اگلی ہجرت میں چند دن ہیں
تو یہ مکاں مجھ کو گھر لگا ہے

(عامر بن علی)

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیقی شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

جمیل یوسف.....جل پری کے دیس میں

کمال پاشا راز

اردو ادب میں سفر نامے کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ ابتدائی دور سے لے کر اب تک جتنے بھی سفر نامے لکھے جا چکے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں، ان میں خالص سفر ناموں کی تعداد حوصلہ افزا نہیں ہے۔ خالص سفر نامہ سیاح کا ہوتا ہے، تاجر، مصلح، مبلغ یا سرکاری درباری شخص کا سفر نامہ، خالص سفر نامے کی ذیل میں نہیں آتا۔ جہاں تک سفر نامے کے فن کا تعلق ہے، اس سلسلے میں ناقدین کا خیال ہے کہ سفر نامہ نگار زمان ومکاں، افراد اور افراد معاشرہ کی خصوصیات پر بھرپور تبصرہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر سفر نگار محض معلومات فراہم کرتا ہے تو یہ کام ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور انٹرنیٹ سے بہتر طور پر لیا جا سکتا ہے۔ سفر نگار کو زحمت اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مذکورہ معیارات کے پیش نظر جمیل یوسف کا سفر نامہ (ڈنمارک) ''جل پری کے دیس میں'' خالص سفر نامہ ہے اور یہ سفر نامہ نثر نگار کا سفر نامہ نہیں بلکہ جمال پرست شاعر کا سفر نامہ ہے یعنی یہ پانی ٹھنڈا بھی ہے اور میٹھا بھی۔ یہ سفر نامہ، اصلاح یا تبلیغ کیلئے نہیں لکھا گیا۔ یہ سفر نامہ محض خوبصورت لڑکیوں کے بیان کے لئے بھی نہیں لکھا گیا اگرچہ اس میں خوبصورت لڑکیوں کا ذکر ہے۔ سفر نگار کو سرکار نے اپنے مقاصد کے لئے بھی نہیں بھیجا بلکہ وہ محض سیاحت کے لئے گیا ہے لہٰذا یہ ایک خالص سفر نامہ ہے۔

جمیل یوسف بنیادی طور پر شاعر ہیں، خصوصی طور پر جمال پرست ہیں۔ یوں ان کی جمال پرستی نے ضمیر جعفری جیسی ہستی کو شہر خوباں اسلام آباد سے جل پری کے دیس تک اور جل پری کے دیس سے اب تک اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا ہوا ہے۔ جمیل یوسف نے اس سفر نامے کے لئے ضمیر جعفری جیسے زندہ دل ہمسفر کا انتخاب کیا، سیاحت کے لئے ڈنمارک اور سویڈن کا انتخاب کیا کہ جہاں کی ہر لڑکی میں موسیقی کے سارے کومل اور اتی کومل سر بولتے ہیں۔ خوش قسمت ہیں جمیل یوسف کہ میزبان بھی اقبال اختر اور زاہدہ بھابی جیسے ملے۔ وہ اقبال اختر اور زاہدہ بھابی جن کے گلشن میں فطرت نے نوید، خرم اور گوشی جیسے گل کھلائے ہیں۔ نوید، خرم اور گوشی جعفری صاحب اور جمیل یوسف کے بوٹوں کے تسمے کھولنے اور باندھنے میں خوش و خرم ہیں۔ دیار غیر میں کھلنے والے ان گلوں سے مشرقی بو باس کوئی نہیں چھین سکا اس لئے کہ پیڑ کی جڑیں اپنی اعلیٰ اقدار اور تہذیب و روایات میں پیوست ہیں۔ مشرقی پیڑ میں مشرقی پیوند ہے تو پھول کیوں نہ مشرقی تہذیب کا رنگ لئے ہوئے ہوں گے۔

224 صفحات پر مشتمل سفر نامے میں جمیل یوسف نے 25 عنوانات قائم کئے ہیں۔ سفر نامے کے عنوانات پر ایک سرسری نظر، سفر نامہ پڑھنے کی ترغیب دیتی ہے شرط یہ ہے کہ آپ لطیف جمالیاتی حس کے حامل ہوں۔ جمیل یوسف کو یہ سفر کرنا چاہئے تھا کہ ارضی جمال محروم نظارہ نہ رہے اور سفر نامہ لکھنا چاہئے تھا کہ اس ارضی جمال کو کوئی جمیل مبصر ہی موضوع بنا سکتا تھا۔ سفر نگار کے لئے اس بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے جو مشاہدے اور مطالعے کو خوبصورتی ادبی زاویہ عطا کر سکے۔ افراد، معاشرے اور تہذیبوں کا موازنہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، تاریخ پر نظر رکھتا ہو، قوم کی رسوم و عادات کو اس کے پس منظر سمیت جانتا ہو اور اس کا خامہ زبان و ادب کی روشنائی میں ڈوبا ہوا ہو، وگرنہ سفر نگار کا تبصرہ صحافی کا تبصرہ بن کر رہ جائے گا لیکن جمیل یوسف خط بخشی کے تمام حربوں سے واقف ہیں۔ وہ لطیفے نہیں سناتے بلکہ بات اس انداز سے کرتے ہیں کہ لطیفہ بن جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ لطیفے پر ہنسی بھی آئے۔ لطیفہ تو لطیف بات ہوتی ہے اور لطیف بات، لطیف احساس کے حامل لوگوں کو ہی لطف دے سکتی ہے۔ جمیل یوسف کے سفر نامے میں ایسی لطیف باتوں کی گنجائش یوں بھی زیادہ نکل آتی ہے کہ وہ ضمیر جعفری جیسے لطیفہ طراز شخص کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ جمیل یوسف نے برمحل اردو، فارسی اشعار اور تشبیات سے زیور کا کام لیا ہے۔ اشعار میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ ہم عصر شعراء کے شعر بھی ہیں اور کہیں کہیں ہلکا سا تصرف کر کے شعر کو اپنی بات کے حسب حال بنا لیتے ہیں۔

کتاب میں کم و بیش چالیس مناظر یا مقامات ایسے ہیں جن کو پڑھ کر اس بات کا قوی یقین ہو جاتا ہے کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ یہ کتاب بالغوں کے لئے تو ہے ہی، بوڑھوں کے لئے بھی اس کے اکسیری اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ساحل سمندر، سن باتھ کا منظر، جمیل یوسف اور جمیل یوسف کی جمالیاتی حس میں ڈوبی ہوئی مرکب تشبیہ ملاحظہ ہو:

''بدن کے دائرے اور قوسیں، گولائیاں اور ابھار، ساحل کی ریت پر یوں پڑے تھے جیسے سکی کمہار نے صراحیاں اور پیالے بنا کر ہر طرف رکھ دیئے ہوں تا کہ دھوپ میں پختہ ہو جائیں''۔

ایسے مناظر جمیل یوسف کی جمالیاتی حس کو بہت تیز کر دیتے ہیں یہاں تک کہ جمیل یوسف خود بھی مختصر ترین لباس پہن کر اس منظر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جمیل یوسف کے بقول:

''یہ قریہ تو جنت کا ایک گوشہ نظر آتا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جنت سے بڑھ کر کیونکہ ابھی تک اس طرح کی کوئی روایت ہم تک نہیں پہنچی کہ جنت میں غسل آفتابی کا بھی کوئی بندوبست ہوگا۔ وہاں مولوی لوگ حوروں کو اتنی فرصت ہی بھلا کہاں دیں گے کہ غسل آفتابی جیسی عیاشی کے مزے لے سکیں''۔

جمیل یوسف کا اسلوب ان کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ وہ روزمرہ کی عام گفتگو میں جس ذکاوت، بذلہ سنجی اور شگفتگی سے کام لیتے ہیں یہی خوبی ان کی تحریر میں بھی ہے۔ وہ اپنے قاری کو اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دیتے۔ جس طرح ایک سیاح ایک جزیرے کی سیر کے بعد دوسرے جزیرے

کی سیر کرنے کا آرزومند ہوتا ہے اسی طرح ان کا قاری ایک ورق کے بعد دوسرے کی طرف سفر کرتا ہوا پوری کتاب ختم کر جاتا ہے۔ یہ اسلوب کا اعجاز ہے کہ وہ قاری کو اپنی گرفت میں اس طرح لے لے کہ قاری لاکھ حیلے بہانوں سے کام لے لیکن زندان اسلوب سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئے۔ آپ ''جل پری کے دیس میں'' داخل ہونے کے بعد محسوس کریں گے کہ واپسی کے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں۔ یاد رہے کہ میں بدذوق سامع یا قاری سے مخاطب نہیں۔ شخصیت، موضوع، فن اور اسلوب کی ہم آہنگی کسی بھی فن پارے کے دوام کی کفیل ہوا کرتی ہے۔ جمیل یوسف کے ہاں اس اصول کی پوری پاسداری ملتی ہے۔ جہاں بات حسن فطرت کی آتی ہے تو جمیل یوسف کے ہاں شگفتگی در آتی ہے۔ اگر بات اخلاقی و تہذیبی اقدار کی ہو تو اسلوب میں عالمانہ سنجیدگی راہ پاتی ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ ہمارے سفر نگار دیار غیر کی اقدار و اماکن سے اس قدر مرعوب ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی تہذیبی و ثقافتی قدروں کا مذاق اڑانے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا لیکن ''جل پری کے دیس میں'' کے سفر نگار کو اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے بڑی محبت ہے۔ دو تین مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں سفر نگار ڈنمارک میں پرانے قلعوں کی سیر کرتا ہے اور پھر ان کا موازنہ شاہی قلعے اور ہائی کورٹ بلڈنگ لاہور سے کرتا ہے۔ اسے جو حسن و خوبی ان عمارات میں نظر آتی ہے وہ ڈنمارک کے کسی قلعے میں نظر نہیں آتی۔ یہاں جمیل یوسف کے تجزیئے اور بیان میں منطقی توازن ہے۔ یہ توازن تعصب سے بالاتر ہے۔ اس سلسلے میں جمیل یوسف کی کرسچن لاؤ آسن (جو ڈنمارک کا معروف مضمون نگار ہے) سے گفتگو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مغربی میڈیا نے اسلام، اسلامی قوانین اور پاکستان کے حوالے سے جو منفی پروپیگنڈا کر رکھا ہے، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں تاہم کرسچن لاؤ آسن کے سوالات کے جوابات جس اجمال، خوبصورت اور دلائل سے دیئے ہیں، وہ قابل صد ستائش ہیں۔ کرسچن لاؤ آسن پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ مغربی دنیا نے عوام اور بالخصوص عورت کو جو حقوق انیسویں صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے پہلے ربع میں دیئے ہیں، اسلام نے وہ حقوق ساڑھے چودہ سو سال پہلے دے رکھے ہیں۔ جمیل یوسف کی مدلل گفتگو کرسچن لاؤ آسن کو اس کے دو دیگر ساتھیوں سمیت بے بس کر دیتی ہے یہ اور اس طرح کے دوسرے مقامات پر ان کی تحریر میں علمی وقار جھلکتا ہے۔

ڈنمارک میں شادی کا رواج بہت کم ہے۔ صرف پچیس فیصد لوگ شادی کرتے ہیں۔ یہ پچیس فیصد لوگ بھی اولاد پیدا کرنے سے کتراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آبادی بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی ہے۔ مرد، مرد سے اور عورت، عورت سے قانوناً شادی کر سکتی ہے لیکن کہیں کہیں صورتحال اس سے مختلف ہے۔ وہ ہم جنس سے شادی کو بھی غیر ضروری تکلف سمجھتے ہیں اور ان کی ایسی عورتیں اپنی اپنی پسند کے کتے پال لیتی ہیں۔ جمیل یوسف نے ایسے مناظر دکھا کر بھی ان کی تہذیب کو بھرپور طنز کا نشانہ بنایا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنی تہذیب کو اعلیٰ ترین تہذیب بنا کر پیش کیا ہے۔ جس کی ایک ہلکی سی جھلک میں آپ کو اقبال اختر اور ان کے بیوی بچوں کے ذکر میں دکھا چکا ہوں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، جمیل یوسف نے ان کی اچھی اقدار کی دل کھول کر تعریف بھی کی ہے۔ یہی توازن ان کی تحریر کو اعتبار بخشتا ہے۔ پچاس لاکھ کی آبادی والے امیر ترین ملک کے افراد تصنع اور بناوٹ سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتے۔ قانون کا احترام کرتے ہیں۔ وہ اپنی ملکہ، وزیر اور وزیر اعظم کا اسی شدت سے محاسبہ کرتے ہیں جس شدت سے پاکستان میں بے کس شریف شہریوں کا کیا جاتا ہے۔ ڈنمارک اور پاکستان کے نظام تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے جمیل یوسف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے تعلیم کے نام پر تجارت کر رہے ہیں جبکہ ڈنمارک میں نہ صرف یہ کہ میٹرک تک تعلیم مفت ہے بلکہ کتابیں کاپیاں تک مفت ہیں اور اگر والدین پانچ سال تک کے بچے کو سکول میں داخل نہ کرائیں تو والدین کو قید کی سزا بھی مفت دی جاتی ہے۔

جمیل یوسف کے سفر نامے میں دوسرے سفر ناموں کی طرح قابل دید مقامات، کتب خانوں، تعلیمی ماحول اور ان لوگوں کی دلچسپیوں کا بھی بھرپور ذکر ملتا ہے۔ اس قدر ترقی یافتہ ملک ہونے کے باوجود باوصف سائیکلنگ سے مردوزن کو عشق ہے۔ صرف بیس فیصد لوگ گاڑی میں یا پیدل سفر کرتے ہیں۔ گاڑی میں سفر کرنے والے یا تو بوڑھے ہیں یا بیمار۔ اسی فیصد آبادی سائیکلنگ کرتی ہے۔ وہ سائیکلنگ کیوں کرتے ہیں؟ یہ سوال جمیل یوسف نے ایک کوک پیتی شوخ حسینہ سے کیا تھا۔ حسینہ نے جواب دیا۔

Oh` you old boy! This my bike` it keeps my bottom toght.

جمیل یوسف نے ڈنمارک کے سیاسی نظام کو بھی انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے سفر نامے کا موضوع بنایا ہے لیکن یہ اختصار تفصیل پر حاوی ہے۔ 1972ء سے 1982ء تک ڈنمارک کا وزیر اعظم ایک ایسا شخص رہا ہے جو بالفعل مزدور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کے منتخب ہونے کی خبر جب ریڈیو ٹی وی نے دی تو اس کی بے خبر بیوی بازار سے سبزی خرید رہی تھی۔ اسے بتایا گیا تو حیران ہوئی اور کسی قدر پریشان بھی کہ اب خاوند کے لئے اسے نیا کوٹ بھی خریدنا پڑے گا۔ اور ایک ہم ہیں کہ پوری قوم کو پہلے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیر اعظم کون ہوگا۔ کرسی صدارت پر کس کا قبضہ ہوگا۔

سفر نامے کے آخری صفحے پر ایک لمبی سی لڑکی نمودار ہوتی ہے جس کا لباس جمیل یوسف کے بیان اور غالب کے بقول: ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کی مکمل تصویر تھا۔ سفر نامے کی آخری تین سطریں اسی زاہد فریب حسینہ کی پیکر تراشی پر مشتمل ہیں۔ یہ آخری تین سطریں قارئین کی حس جمال کی آبیاری کے لئے پیش کی جاتی ہیں:

''وہ ہمارے پاس سے گزری تو اس کی دبلی پتلی کمر سے لے کر اس کی گردن تک کی اٹھتی ہوئی بناوٹ سے یوں لگا جیسے کوئی صحرائی محو خرام ہو۔ اگر غالب کے الفاظ میں جوش بادہ سے شیشے اچھل سکتے تو صراحی حرکت میں کیوں نہیں آتی''۔

امرتا پریتم کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

آفتاب احمد

امرتا پریتم جدید ہندوستان کے معروف قلم کاروں میں سے تھیں۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنہیں ہندوستان کا اعلیٰ ترین ادبی اعزاز، ساہتیہ اکیڈمی ادبی انعام دیا گیا۔۱۹۸۲ء میں انہیں بھارتیہ گیان پیٹھ انعام دیا گیا اور ۱۹۸۶ء میں ان کو پارلیمنٹ کے ایوان بالا کا رُکن منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کے صدر نے انہیں ''پدم شری'' کا خطاب بھی دیا۔ ان کی نظمیں اور کہانیاں دنیا کی ۳۴ زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔

اپنی تمام تحریروں میں سے ان سترہ کہانیوں کا انتخاب خود امرتا پریتم نے کیا تھا۔ اس طرح یہ ان کی تخلیقی فن کاری کا نچوڑ ہے۔ اس انتخاب کی یہ اہمیت بھی ہے کہ یہ ادبی انعام کے ملنے پر ہندی میں شائع کیا گیا تھا۔ ان کی نظمیں اور کہانیاں پنجابی اور ہندی کے ساتھ اردو میں بھی اتنی ہی معروف ہیں۔ نامور ادیب خورشید قائم خانی نے نئے سرے سے ان کہانیوں کو اس احتیاط کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے کہ ان کی اصل روح محفوظ رہے۔

''سترہ کہانیاں'' امرتا پریتم کا خود منتخب کردہ افسانوں کا انتخاب ہے جو ان کی زندگی میں ہی منظر عام پر آیا۔ یہ افسانے ہندی زبان میں شائع ہوئے اور ان کا ترجمہ خورشید قائم خانی نے احسن انداز میں کیا ہے جو ان کی وفات سے قبل ان کی عیادت کے لیے ہندوستان گئے تھے تو ان کو یہ کتاب تحفہ میں ملی تھی۔ ترجمہ ایک فن ہے اور وہی اچھا ترجمہ کر سکتا ہے جو دوسری زبانوں کا علم رکھتا ہے اور نہ صرف علم بلکہ رموز زبان پر مکمل مہارت رکھتا ہو کیونکہ ترجمے کا عمل پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔

افسانوں کی یہ ترجمہ شدہ کتاب اردو قارئین کے لیے ایک بیش قیمت خزانے سے کم نہیں ہے۔ جنگلی بوٹی، بو، لٹیا کی چھوکری، گانجے کی گلی، پانچ برس لمبی سڑک، شاہ کی کنجری، ایک شہر کی موت، آتم کتھا، نہ جانے کون رنگ رے، زری کا کفن، گئو کا مالک، پچیس چھبیس اور ستائیس جنوری، اپنے اپنے چھید، یہ کہانی نہیں، تیسری عورت، اور ندی بہتی رہی اور ترشول سترہ کہانیاں شامل ہیں جو اپنے موضوع اور اسلوب کے حوالے سے اپنی ایک خاص پہچان کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔

''لٹیا کی چھوکری'' ایک شاہکار افسانہ ہے۔

اس افسانے میں ''چارو'' ایک معاشرتی فعال کردار ہے جو Social Empowerment کے طور پر آیا ہے۔ چارو ایک عام غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والی خوددار، غیور اور ذمہ دار خاتون ہے جس کی زندگی ہماری معاشرت کی عورتوں کے لیے مثالی نمونہ ہے۔ چارو کو اگر اپنے حسب معاش کی فکر ہے تو دوسری طرف اسے مامتا کی محبت اور انتقام لینے کی فکر پریشان اتنا جھنجھوڑتی ہے کہ وہ یہ عزم صمیم کر لیتی ہے کہ جب تک اپنی ماں کے قاتل کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دے گی تب تک وہ اپنے ہاتھ میں کانچ کی ایک چوڑی تک نہیں پہنے گی۔ معاش کی فکر کے ساتھ ساتھ چارو کو جہاں ماں کے قتل کا انتقام لینا ہے تو اپنے پریم کی اتنی فکر ہے کہ وہ اپنے عاشق نہکو کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی ہے۔ فرائض اور ذمہ داری سے زندگی گزارنے والی چارو ایا ایسا مصمم کردار ہے جو ہر عورت کے لیے ایک مثال ہے جہاں عورت جبر کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

اپنے افسانے میں امرتا پریتم لکھتی ہیں

''اونہکی! میں تجھے شروع سے پیار کرتی تھی۔ پر میں تجھے کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اور جب تک میں اپنے ہاتھ سے بدلہ نہ لیتی تو میری ماں کی روح کو چین کیسے آتا!'' (۱)

چاروں کے انتقام کے حوالے سے یہ بات کر دینا ضروری ہے کہ عورت کے انتقام کا جذبہ یا خواہش صرف ایک چارو تک محدود نہیں ہے کیونکہ عورت کی جبلت یا فطرت میں انتقام کی آگ موجود ہے اور شاید جبلت کی تسکین کے لیے مرد کی طرح عورت کی تسکین کے لیے بھی یہ ناگزیز ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اس کیفیت کی لذت سے سرشاری حاصل کرے۔ چارو سے بے حد متاثر کردار دیس راج ہے جو شادی کی رات ہی ''چارو'' کی تصویر پاروتی کی گود میں منہ دکھائی کے طور پر ڈال دیتا ہے۔ پارو کو پل بھر کے لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا ہو لیکن بعد میں دیس راج اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس نے چارو کے من کو کیسا پایا ہے تو تب اس کے من کی دنیا سے عورت کے من کا روپ روشن ہو کر مثالی صورت اختیار کر گیا ہے۔ دیس مار اپنے خطے میں رہنے والی عورت کی عظمت اور تشخص کا قائل ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی نئی نویلی پتنی سے بھی ایسے ہی مثالی من اور وفا کا منتظر ہے۔

محبت ایک جبلت ہے اور نہ صرف انسان بلکہ حیوان بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ محبت ایک ایسا لطیف جذبہ ہے جو انسان کے من کو ایک نئی اور انوکھی دنیا سے روشناس کراتا ہے جس سے باطن کے چراغ روشن ہوتے ہیں اور زندگی جنت نظیر بن

جاتی ہے۔عورت کی جبلت میں بھی محبت کا جذبہ موجود ہے تبھی تو پاروا پنے میاں دیس مار کے خوابوں کی ملکہ بن کر اس کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کی خواہاں ہے۔

افسانے سے ایک اقتباس:

''دیس راج کے سینے سے سر لگا کر پارو نے ایک بار پھر چارو کی تصویر کو دیکھا اور اسے اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے سوچنے لگی کہ وہ چارو کے روپ کو اپنے روئیں روئیں میں بسالے گی اور وہ دیس راج کے من میں اس طرح بس جائے گی جس طرح اس کے من میں چارو کے من کا روپ بسا تھا۔''(۲)

عورت محبت و وفا کی دیوی ہے اور اس کی سرشت میں یہ جذبہ شدت سے موجود ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت شعاری کرے۔ چارو کی طرح پارو بھی محبت کی عملی تصویر اور مثال بن جانے کی خواہش مند ہے جس سے اس کا شوہر دیس راج محبت کی گیان پا کر مکمل ہو جائے۔

افسانہ ''ایک شہر کی موت'' میں آٹھ صدی قبل انلی کے قدیم شہر پامئی کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ شہر سنگ تراشی اور بت تراشی کی شہرت کے ساتھ جہازی بندرگاہ کے طور پر بھی جانا جاتا تھا لیکن لاوے کا پہاڑ پھٹ جانے سے یہ شہر پل بھر میں آگ کی گرم راکھ کے نیچے دب گیا تھا۔تذکرہ شہر کے ساتھ ہی عورت کی جبلت جو ایک ناگزیریت ہے اس سے انکار کرنا بھی محال ہے۔کائنات میں جاندار تمام ترین اشیاء ایک جوڑے کی صورت میں موجود ہیں اور نسل انسانی ہو یا حیوانی، تمام جاندار چیزوں میں نر اور مادہ یعنی جوڑے کا تصور جہاں نسل کا ارتقا ہے تو وہاں ایک حیاتیاتی فعال زندگی کی ایک ضرورت بھی ہے جس سے انکار ناممکن امر ہے۔جبلت یعنی حیاتیاتی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے جیتے رہنا انسانی زندگی کا حسن ہے تو خوراک کی طرح ایک فعال جسمانی ضرورت کا خاصہ بھی ہے۔ افسانے میں کلیر ایک ایسی عورت ہے جو جسمانی تسکین کے لیے مردانہ انگ کو بھی اپنانے سے گریز نہیں کرتی ہے۔مردانہ انگ ایک عورت کے زندہ وجود کے لیے شاید یہ اس کی بے بسی کی علامت ہے اس کا مداوا ایک آلے کی صورت میں اس کی تسکین کا جزو لازم بن کر اسے تنہائیوں میں جذبات کی شدت سے ہمکنار ہونے کا ایک ناگزیر جواز فراہم کرتا ہے۔سماج کی جکڑ بندیوں اور جبلت کے حوالے سے یہ ایک شاہکار افسانہ ہے۔

افسانے سے ایک اقتباس:

''میری انگریز دوست کلیر بڑی عمر کی عورت ہے۔اس دن اس نے مجھے ایک چیز دکھلائی.....ایک مردانہ انگ، جو اسی ہفتے وہ بازار سے خرید کر لائی تھی۔ اس میں بیٹری کے دو سیل پڑے ہوئے تھے.....اس نے بتایا کہ وہ بیٹری کے زور سے چلتا ہے اور اس کے لفظ اس دن اس پر ترس کھا رہے تھے.....کیا کروں، اب اس عمر میں کوئی مرد پاس نہیں پھٹکتا.....طلاق لیے سات برس ہو گئے ہیں۔ پہلے تو کبھی دو چار دنوں کے لیے کوئی مل جاتا تھا، پر اب جوں جوں عمر ڈھل رہی ہے.....اور مجھے لگا، اگر میں نے اپنی جوانی اپنی ریتوں کے حوالے کر دی تو آنے والی عمر میں مجھے بھی ایک دن کلیر کی طرح بازار جانا پڑے گا، اور بیٹری والا یہ ربڑ کا ٹکڑا میری قسمت بن جائے گا۔''(۳)

اس اقتباس سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ افسانہ ''خارستان وگلستان'' کی طرح عورت میں وصل کی جبلی خواہش اس افسانے میں بھی نقطہ عروج کو چھو رہی ہے۔الم کی اس سے بڑی اور بھیانک ترین کیا صورت ہوگی کہ انسان خود اپنے ہاتھوں کے بنائے کھلونے سے اپنی جبلت کی تسکین کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔جبلت کو دبا دینے سے انسان کا اعصابی نظام متاثر ہو سکتا ہے یا نفسیات کی جبلی اساس کے مطابق انسان Neuorosis disorder میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

افسانہ ''زری کا کفن'' میں نفسیاتی ابنارمل کیفیت ''حسد'' کو اجاگر کیا گیا ہے۔مردوں میں بھی حسد تو ضرور پایا جاتا ہے لیکن حسد کی آگ کا غالب مرکز ومحور شاید ہی نہیں بلکہ یقیناً عورت ہی ہے۔حسد کی آگ میں جلنے والا اپنے باطنی الاؤ کو کبھی بجھنے نہیں دیتا اور اس الاؤ کی حرارت میں اس درجہ شدت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے کہ حاسد اسی اپنی لگائی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔اس افسانے میں بھی زری اور اس کی مدمقابل ایک ایسی عورت کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو زری کو اپنی بہو بنانے سے انکاری ہے۔زری کی بھی یہ ضد ہے کہ وہ اسی کے گھر میں بیاہ کر جائے اور اسے اس کی بہو بننے کا شرف حاصل ہو جائے تو اس شاندار کامیابی پر حاسد عورت بھی اپنے غرور حسد کے اختتام کو پہنچ جائے گی۔

افسانہ انا کے یا حسد کے بت کو مسمار کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ایک عورت زندگی میں اکثر اوقات دوسری عورت کا وجود تسلیم ہی نہیں کرتی، شاید کبھی تو حاکمیت میں فقدان کی بدولت تو کبھی حسد کی صورت میں۔پہلو کوئی بھی ہو، جہاں ایک طرف حسد کی آگ ہوگی تو وہاں ایک زبردست انتقام کا جذبہ بھی ضرور کارفرما ہوگا۔لفظوں میں بڑی قوت ہوتی ہے اور جیسے حشرات ڈس لیتے ہیں تو ایسے ہی انسانی زندگی کے معاملات میں الفاظ ایسے ڈس لیتے ہیں کہ انسان جینے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

اپنے افسانے ''زری کا کفن'' میں امرتا پریتم لکھتی ہیں:۔

''اس نے کہا تھا تو جیتے جی دہلیز پار نہیں کر سکتی، میں جیتے جی تیرا منہ نہیں دیکھوں گی۔ میں تبھی مر گئی تھی، وہ آج مری ہے۔ یہ تو ایک لاش دوسری لاش سے ملنے آئی تھی۔''(۴)

اس افسانے میں حوا کی بیٹی ''مینا'' کے دکھ کو بیان کر کے صنف نازک کے دکھوں کی بپتا کی نمائندگی کی گئی ہے۔ معاشرے میں بیٹی کا پیدا ہونا جرم ہے، شادی ہو جانا اور پھر گھریلو زندگی کے مسائل میں چکی کی طرح پستے رہنا اور اگر عورت کا شوہر وفات پا جائے تو جیتے جی مر جانا یہ ایسے دکھ ہیں جن کی خوگر برصغیر کی عورت رہی ہے۔ یہ ایک عورت ہی ہے جو دکھ کی کوکھ سے جنم لے کر حیات چند روزہ کو بھی دکھوں کے حوالے کرتی ہے اور غم کھانے کی ایسی عادی ہو جاتی ہے کہ اس کا مداوا ہی دکھوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ دکھ دریا میں انسان یعنی مرد تو شاید ایک بار مرتا ہے لیکن عورت ذات کا جنم دکھ ہے، حیات دکھ اور دکھوں کا زہر پی پی کر مر جانا ہی انت ہے۔ مینا کی شادی ہوتی ہے تو شادی کے کچھ دن گزرنے کے بعد ہی سرکاری مہروں کے ساتھ لگا ہوا ایک خط دراصل اس کے شوہر کی موت کا پیغام نہیں ہوتا بلکہ خود مینا کے لیے ایک ناگہانی آفت ثابت ہوتا ہے مینا اپنے میکے آتی ہے اور یہ خبر ان کے گھر والوں کے لیے ایک نوحہ بن جاتی ہے۔

''ارتھیاں گھروں سے باہر جاتی ہیں، پر جب مینا اپنے میکے آئی تو سب کو یوں لگا، جیسے ایک ارتھی گھر میں آ گئی ہو.....''(۵)

مینا جواب بیوہ ہے اور اپنے میکے میں رہنے لگی ہے تو اسے اپنے گھر میں گزارے وہ پل یاد آتے ہیں جو اس نے بھانجے اویناش کی تربیت میں گزار دیئے تھے۔ اویناش جو مینا کا بھانجا ہے اس کی قربت میں مینا کے شب و روز گزرنے لگتے ہیں اور اب شاید مینا کو اپنے احساس تنہائی کو ختم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ مینا دراصل اویناش میں اپنے شوہر کا چہرہ اور دوسرا اس سے ہونے والے بچے کا عکس دیکھنے کی کوشش کرتی ہے مگر ایک اس دنیا سے جا چکا ہے تو دوسرے کی آمد نہیں ہو سکتی۔

افسانے سے ماخوذ ایک سطر:

''مرد مر جائے تو عورت کے خواہ سارے انگ زندہ رہتے ہیں مگر اس کی کوکھ ضرور مر جاتی ہے اور کھویا ہوا پل مینا کے شریر میں ٹیس مارنے لگتا۔''(۶)

مرد کے مر جانے کے ساتھ ہی عورت کی موت بھی وقوع پذیر ہو جاتی ہے لیکن عورت کو زندگی کا زہر قطرے قطرے کی صورت میں پینا پڑتا ہے۔ مینا، اویناش میں اپنے پتی اور ممتا کے جذبے کی تلاش کی متلاشی ہے جو کہ دونوں چیزیں ناممکنات میں سے ہیں۔

بیوہ مینا ایک تلخیوں کے بند دروازے میں زندگی بسر کرنے لگتی ہے تو اس کی قربت اویناش سے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور یہ قربت بالآخر ایک جنسی اور جبلی تسکین میں بدل جاتی ہے۔ جبلت کا غالب بوجھ آخر کب تک عورت اٹھائے رکھ سکتی ہے۔ جبلت سے مجبور و مقہور مینا اپنے آپ کو شادی شدہ مینا کے روپ سے جس قدر آزاد کرتی ہے تو دوسری طرف بیوگی کا بوجھ بھی اسے اپنے کندھوں سے اتار کر پھینکنا پڑتا ہے اور تیسری عورت ایک صحت مند تو نہیں بلکہ جبلی خصائص سے مجبور ہو کر اسے بالآخر اسی دروازے پر دستک دینا پڑتی ہے جس کو پال پوس کر اس نے خود جوان کیا ہوتا ہے۔ افسانے میں جہاں عورت کے بیوہ ہو جانے اور اس کی بیوگی کی صعوبتوں کا ذکر گیا ہے تو ساتھ ہی ایک ایسے بوجھ یا جبلت کو ایک غالب پہلو کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو عورت کو روپ بدلنے پر مجبور کرتا ہے اور جنسی تسکین کے لیے اسے کئی بوجھ اتارنا پڑتے ہیں۔

''تیسری عورت'' افسانے سے ایک اقتباس:

''عورت اور مرد کے کپڑے کانپ کر چارپائی کے نیچے گرے اور پایوں کے ساتھ سر جھکا کر گٹھڑی کی طرح ڈھیر ہو گئے۔ یہ ایک روح کو روح کے ساتھ چھو لینے والا خاموش لمحہ نہیں تھا..... ایک طوفان خیز گھڑی تھی جس میں ایک عورت من کے رسم و رواج کو کچل کر تن کے ناقابل حصول کو کھوج رہی تھی، جب کہ ایک مرد سخت گھبراہٹ کی کیفیت میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب طوفان بھری لہریں گزر گئیں تو مینا ایک نئی موت مر گئی..... صرف مینا نہیں، مینو بھی.....''(۷)

حوالہ جات:

۱۔ افسانہ: ''لٹیا کی چھوکری''، مشمولہ: سترہ کہانیاں، کراچی، فضلی سنز، ۲۰۰۲ء، ص: ۳۷

۲۔ ایضاً، ص: ۳۸

۳۔ افسانہ: ''ایک شہر کی موت''، مشمولہ: سترہ کہانیاں، کراچی، فضلی سنز، ۲۰۰۲ء، ص: ۷۹۔۷۸

۴۔ افسانہ: ''زری کا کفن''، مشمولہ: سترہ کہانیاں، کراچی، فضلی سنز، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۰۳

۵۔ افسانہ: ''تیسری عورت''، مشمولہ: سترہ کہانیاں، کراچی، فضلی سنز، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۳۴

۶۔ ایضاً، ص: ۱۳۸

۷۔ ایضاً، ص: ۱۳۹

''خالد مسعود'' کی بے ساختگی پر ایک نظر

ڈاکٹر نائلہ صدف/لاہور

خالد مسعود کا شمار عہد حاضر کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ پہلے شعری مجموعے ''رعنائی'' کی اشاعت کے بعد اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ''بے ساختگی'' 2017ء میں منظر عام پر آیا۔ ''رعنائی'' کی طرح ''بے ساختگی'' کو بھی خوب پذیرائی حاصل ہوئی اور ملک کے نامور شعرا نے نہ صرف ان کے کلام کو سراہا بلکہ اپنی آراء سے بھی نوازا۔

نامور ادیب جنید بختیار نے مجھے ان کا مجموعہ ''رعنائی'' اور ''بے ساختگی'' مطالعے کے لیے دیے اور حسب عادت مسکراتے ہوئے کہا ''ان کو پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ معذرت خواہ ہوں کہ کچھ صحت کی خرابی کی وجہ سے میں ان کو نہ تو پڑھ سکی اور نہ اپنی رائے کا اظہار کر سکی۔

بہر حال ان دونوں کتب کا مطالعہ کیا دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر شعری لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔

اب آتے ہیں ''بے ساختگی'' کی طرف۔ جیسا کہ میں ذکر کر چکی ہوں کہ یہ ''رعنائی'' کے بعد 2017ء میں منظر عام پر آئی۔ ''بے ساختگی'' کی ابتدا حمد باری اور نعت سے ہوتی ہے۔

حمد باری تعالیٰ میں اللہ تعالیٰ کی شان کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

ہیں نمایاں ہر طرف جلوے ہی تیری شان کے
تو ازل سے تا ابد ہے زندہ و پایانِ تو
ہر گھڑی سجدہ کناں ہے دل تری ہی ذات کو
میرا ایماں میرا درماں شوق کا سامان تو

نبی پاک کے عشق میں ڈوبے ہوئے سرشار نظر آتے ہیں اور بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں کہ:

جسد خاکی وہ جہنم سے صدا محفوظ ہے
جس کے دل میں ہو گیا روشن مقامِ مصطفیٰؐ
بیم ہستی سے ہراساں حشر میں تھے لوگ سب
یاد ان کو کچھ نہیں تھا، صرف نامِ مصطفیٰؐ

یہ والہانہ عقیدت اُن کی غزلوں میں بھی جا بجا ملتی ہے۔ مثلاً:

کہ دعویٰ اپنا بھی مسعودؔ ہے محبت کا
مگر خدا کی بھی وارفتگی قیامت ہے
ہر ایک شے کا ہے اوجِ کمال پر جلوہ
مرے خدا کی بھی پیمانگی قیامت ہے

.....

تمہارا لطف و کرم ہم پہ گر نہ ہو یارب
یقیں سے خطرہ ہے ہم کو گماں سے خطرہ ہے

.....

جو رنگ و بو سے ہے مہکا ہوا وطن اپنا
کسی حسین کی ہیں باغبانیاں مسعودؔ

.....

بندگی شانِ بندگی بن کر
مظہر ذات ہو گئی ہوگی

اگرچہ انہوں نے روایت سے جڑی ہوئی شاعری کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جدیدیت کا حسین امتزاج کا بھی نمونہ ہے۔

حیا کے رنگ سے کرتے ہیں دل کو بے قرار اکثر
وہ اپنے ناز سے اِترا کے دل پر وار کرتے ہیں
غضب اس دل پہ ڈھاتی ہے وہ ان کی مسکراہٹ بھی
وہ شوخی نازکی سے اور ادا سے وار کرتے ہیں
ترنم اُن کی صدا میں ادا میں شوخی ہے
مرے الم کو شگفتہ بہار کرتے ہیں
پھرے ہیں چاک گریبان کر کے فرقت میں
نگاہ و قلب و جگر پر ہی وار کرتے ہیں

.....

ہے شوخی حشر تو افسردگی قیامت ہے
شباب حسن کی دوشیزگی قیامت ہے
اگر وہ اذنِ نظر بخش دے غنیمت ہے
محال باتیں اُسے من کی سنانیاں مسعودؔ

ان کے ہاں شاعری میں عشق کی رنگینیاں، محبوب کے حسن و جمال کے نظارے، ہجر و فراق کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ جو ان کے سینے میں برسوں سے چھپے ہوئے رنج و الم کو عیاں کرتی ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

تیری سرد مہریوں کا نہ کوئی علاج دیکھا
کبھی غم چھپا کے روئے کبھی غم سنا کے روئے

.....

رات بھر وہ ساتھ تھے اور اپنی آنکھوں سے مجھے
سب جہاں دکھلا دیے ہیں اور کہا کچھ بھی نہیں

.....

میرے دل کے اور آنکھوں کے ہزاروں اضطراب
لمس سے بہلا دیے ہیں اور کہا کچھ بھی نہیں

.....

میں اُن سے گفتگو کرتا کہاں مجھ میں یہ جرات تھی
جھکی نظروں سے لیکن بزم میں ان کا سلام آیا

.....

ذہن سے دور نہیں ہوتا تصور اُس کا
دل کے دامن سے لپٹتی مرے یاد کی بات

.....

ہم ترا نام سرِ بزم لیا کرتے ہیں
تیرے لب پہ بھی کبھی نام ہمارا ہوگا

خالد مسعود کی شاعری میں پنجاب کی ثقافت کا رنگ جھلکارے مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ پنجاب کو لوک داستان ''سوہنی مہینوال'' جب سوہنی کچے گھڑے پر تیرتی ہوئی اپنے محبوب کو ملنے جاتی ہے اور دریائے چناب کی ظالم لہریں اُسے بہا کر لے جاتی ہیں۔ اس کی منظر کشی انہوں نے بڑے خوب صورت انداز میں کچھ اس طرح کی ہے کہ:

وہ ایک کچا گھڑا اور چناب بپھرا ہوا
مگر تھیں عشق کی رُت پر جوانیاں مسعود

اسی طرح انتظار کی کیفیات سے گزرتی گھڑیوں کے احساسات کا عمدہ بیاں:

تیرے خیال کی خوشبو آئی مہک اُٹھے در و بام پیا
پھر دکھلایا چاند نے رُخ تم یاد آئے سرِ شام پیا

.....

تیرے ہی چرنوں میں ہوگا میرا پیار تمام پیا
تیرے پیار کے کارن میں تو سہہ لوں گی آلام پیا

.....

تیری من موہنی صورت پہ قرباں کردوں جگ سارا
دنیا سے کیا لینا مجھ کو تیرے پیار سے کام پیا

.....

چاند کی کرنیں میری کٹیا میں نہ آئیں تو غم کیا
تیرے خیالوں کے محلوں میں کرلوں گا بسرام پیا

انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول کا مشاہدہ گہری نظر سے کیا ہے۔ موجودہ دور میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی رویوں کی جو ٹوٹ پھوٹ، انسانی زندگی میں جو ظلم و جبر، بے انصافی، لوٹ مار اور معاشرے میں پھیلی ہوئی افراتفری کی عکاسی ان اشعار میں کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

ہمیں شکایت نہیں کہ کیوں ہیں اداس رہرو اداس راہیں
جو زندگی ہی میں تلخیاں ہوں کہاں سے لائیں مٹھاس راہیں

تکمیل جس کی شام و سحر سے نہ ہو سکی
خود زندگی بھی آرزوئے ناتمام ہے

.....

اے میرے مولا مجھے صاحب جنوں کردے
کہ مصلحتوں کی یہ فرزانگی قیامت ہے

.....

رہوں کیوں بدگماں میں اس کے بارے میں
زیادہ سے زیادہ بے وفا ہوگا

.....

جن کا دن کٹ سکا ہے مشکل سے
ان کو بتلاؤ رات آتی ہے

.....

کہنے کو بادہ خانے میں بھی اذنِ عام ہے
ساقی نہ محتسب ہے نہ مئے ہے نہ جام ہے

ان کی شاعری میں جمالیات اور نرگسیت کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔ چاند، ستارے، پھول، پتے، ہوا، مہکتی فضائیں ایسے میں محبوب کی ادائی دل فریب منظر پیش کرتی ہیں۔

وہ دھیان پھول مہکے نظر آیا وہ سراپا
لگیں گانے وہ گھٹائیں تری آرزو کے نغمے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

تری لاج کی چنبیلی ترے بانکپن کی کلیاں
دل و دیدہ کو سنائیں تری آرزو کے نغمے

.....

ہم تو خزاں کے دور میں گلشن پرست تھے
جب دیکھنے کو کچھ نہ تھا دامانِ داغ میں

.....

بارشوں میں رنگوں کی حسن کی ادا دیکھی
چھیڑتی ترے گیسو جھومتی صبا دیکھی

موسم کے رنگ پر ہے تمہاری ادا کا رنگ
ایسی ادا سے بننا سنورنا نہ چھوڑنا

نرگسیت اُن کے ہاں جا بجا ملتی ہے۔ اس کا ایک رنگ ان اشعار میں دیکھئے:

دیوانی ہوں جہاں میں پیا، تیرے نام کی
ہاتھوں پہ میرے ہوگی حنا تیرے نام کی

.....

ہو جائے گا مجھے ترا دیدار ایک بار
پہنوں گی ایک دن میں ردا تیرے نام کی

ہندی رنگ میں رنگا یہ شعر ملاحظہ کریں:

مدرا بھری ہے تیرے چنچل متوارے سے نینا میں
تیری ایسی زُلفوں کی چھب دن میں ہے نہ رینا میں

.....

ماتھے کی یہ بندیا تیری اور سندر تل چہرے کا
شامل ہو کر سامنے آئے سندرتا کی سینا میں

ان کے ہاں انتظار کی مختلف کیفیات کے بھی ان گنت رنگ ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

میری خلوتوں میں جانے تیرا غم کہاں سے آیا
کہ اُمید و نا اُمیدی یہاں سُر ملا کے روئے

.....

یہ تری طرزِ تغافل ہے خرد کی سازش
کیوں بھلا بات نہ بنتی جو بنائے رکھتے

.....

اُن کا وعدہ کبھی وفا نہ ہوا
آج تک انتظار کرتے ہیں

.....

بزم میں سب کو ہے اپنوں کی محبت حاصل
کب یہاں کوئی ہمارا بھی سہارا ہوگا

.....

ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں تیرے نظارے کی اک جھلک کو
کبھی تو آہٹ سنیں گے تیری بجھا ہی دیں گی یہ پیاس راہیں

.....

کہاں گئے میرے وہ دوست، ہم نفس وہ ندیم
تھیں جن سے صحبتیں اپنی پرانیاں مسعود

نرگسیت کے علاوہ خالد مسعود کی شاعری میں استاد شعرا کی طرح موسیقیت کا رنگ بھی بڑا نمایاں ہے۔ جو موجودہ دور کے شعرا میں بہت کم ملتا ہے۔ رباط کی شاعری آج کل متروک ہوتی جا رہی ہے لیکن یہ قدیمی رنگ کی شاعری خالد مسعود کے کلام میں واضح ہے:

اس کے سانسوں کی خوشبوئیں کیا ہیں
لب ہیں جس کے گلاب کی صورت

.....

چہرہ مہتاب اور ادائیں شوخ
اُف وہ حسنِ شباب کی صورت

اپنے پیارے وطن سے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ظلم و جبر کی چکی میں پسے ہوئے انسان کو جب وہ غرض کی سولی پر لٹکا دیکھتے ہیں تو بے اختیار دل سے آہ نکلتی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

کہنے سے پاک گریہ میرا نماز ہوتا
چاہت کی سرزمیں پر اُلفت کا راج ہوتا

.....

شمعیں جلا کے رکھتے کیوں روز بام پر ہم
برہم جو آندھیوں کا ایسا مزاج ہوتا

.....

مسعود امن ہوتا میرے وطن میں ہر سُو
جنت مثال جیسا اپنا سماج ہوتا

مرثیہ کسی پیارے کی یاد میں نوحہ خوانی اُس وقت کی جاتی ہے۔ جب کوئی بچھڑ جاتا ہے۔ فانی دنیا سے جانے کے بعد لوٹ کر نہیں آتا۔ موت ایک حقیقت ہے۔ کڑوا سچ ہے جس کو ہم نے ہر صورت قبول کرنا ہے۔ اس کے باوجود بچھڑنے والے کا غم ایسا کہ دل پھٹ جائے۔ اُس کی جدائی سے جوئے خون بہاتی آنکھیں۔ ایسی ہی کیفیت اپنی والدہ کی وفات پر خالد مسعود کی ہے۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں کہ:

جب کوئی جدا ہوتا ہے
دل خون کے آنسو روتا ہے

.....

سینے سے دھواں سا اُٹھتا ہے
شہر دل بھی جلتا ہے
پھر بھی مختار وہی ہے
سب کا پالن ہار وہی ہے

خالد مسعود نے اپنی شاعری میں بے پایاں انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ بڑی سے بڑی بات کو دو مصرعوں میں آسان اور سادہ زبان میں اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری اُن کی غزلیں پڑھ کر لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آخر میں مجھے اتنا کہنا ہے کہ خالد مسعود کی شکل میں سرزمین لاہور نے ہمیں ایک اور خوبصورت شاعر عطا کیا ہے اور خالد مسعود نے ''بے ساختگی'' کے نام سے خوب صورت اشعار کا گل دستہ اُردو ادب کی جھولی میں ڈالا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح شاعری کرتے رہیں۔ ان کی آنے والی کتاب کا شدت سے انتظار رہے گا۔ خالد مسعود کے کلام سے منتخب چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خرد کی بات زباں پر کبھی نہیں آئی
ہمیں ازل سے ملا ہے جنوں کا پیراہن

.....

جاتے ہیں کسی گھر میں تو لیتے ہیں اجازت
تو نے مگر اے گردشِ ایام نہ پوچھا

.....

تمہارے شہر سے نکلے تو منزل ہی بھلا بیٹھے
جہاں ہم رک سکیں ایسا نہ پھر کوئی مقام آیا

.....

نہ رنگ و خوشبو نہ صوت و نغمہ نہ دل نوازی ہے رہگذر میں
چلے گئے تم تو رہ گئی ہیں محبتوں کی اداس راہیں

.....

ترے پیار کی فضا میں کبھی ہم بھی سانس لیتے
کوئی کام کاج کرتے کوئی کام کاج ہوتا

.....

ہم تو خزاں کے دور میں گلشن پرست تھے
جب دیکھنے کو کچھ نہ تھا دامانِ باغ میں

.....

کام آئی مرے ویرانی گلشن مسعود
میرے چہرے کو خزاں نے بھی نکھارا ہوگا

.....

یوں بھی ڈھاتے ہیں غضب سمٹے ہوئے گیسو تیرے
رات ہو جاتی جو کچھ دیر سجائے رکھتے

.....

جہاں میں نہیں ہوں گے تو کیا ہوگا
یونہی سورج اُبھرتا ڈوبتا ہوگا

.....

چہرے پہ بکھر جاتی ہیں اس طرح سے زُلفیں
چھپنے کے لیے ڈھونڈے ہے جوں چاند بہانے

.....

لوگ جاگے ہی نہیں خواب تمنا سے ابھی
کون سمجھے گا ہمارے دلِ بیدار کی بات

.....

جو دن گزرتا ہے مسعود یاد سے غافل
ہم اس کو رات میں اپنی شمار کرتے ہیں

.....

اب آندھیاں بھی خوف سے آتی نہیں نظر
مسعود ہم نے بجلیاں بھر دیں چراغ میں

اردو میں فکاہی شاعری

لبنیٰ صفدر/ لاہور

عرب کا مشہور مقولہ ہے کہ

"الملتح فی الکلام کالملتح فی الطعام"

یعنی کلام میں ظرافت کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو نصیب ہے۔

کسی بھی قوم کی ذہنی پختگی اور اُس کی زبان کی لطافت کا معیار جانچنے کا بہترین آلہ ادبی ظرافت اور اس قوم کا احساسِ خراج ہے۔ صلاح الدین احمد کہتے ہیں:

''یہ ایک مانی ہوئی بات ہے، کسی بھی ادب میں ظرافت عالیہ اس وقت معرضِ نمو میں آتی ہے جب اس ادب کا قوام پختہ ہو کر اپنے وسائل کے معیار کے لیے معیاری لطافت حاصل کر لیتا ہے۔ مقام حسرت ہے کہ اس معیار کے اعتبار سے ہماری زبان دنیا کی پختہ تر زبانوں میں شامل ہو چکی ہے۔

فکاہی (عربی صفت) ہے جس کے معنی مزاحیہ، پرلطف اور ظریفانہ کے ہیں۔ خوش طبعی، زندہ دلی، لطیف، چٹکلا اور ہنسی و ظرافت کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ ہنسی کا تعلق خالصتاً فرد کی ذاتیات سے ہے۔ جبکہ طنز و مزاح معاشرہ کے مثبت و منفی رویوں کے پہلوؤں کے عکاس ہوتے ہیں اور کسی قوم کی سائیکی کے لطیف یا کثیف گوشوں کا مظہر بھی ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک معاشرتی سطح پر ناہمواریاں رہیں گی ہمیں ملا دو پیازہ اور شیخ چلی کی ضرورت بھی رہے گی۔ مزاح جب ادب میں اظہار پاتا ہے تو اسلوب کے اوصاف سے اس کے کھردرے پن اور نوکیلے پہلوؤں کو کیموفلاج کیا جاتا ہے۔ ہماری شاعری اور بالخصوص غزل میں واعظ، محتسب، ملا اور ناصح وغیرہ کو جب ہدف بنایا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی معاشرہ کا وہ آزاد رویہ ہے، جس سے بالعموم یہ لوگ متکارب ہوتے ہیں، اس لیے انہیں پابندی، جبر اور احتساب کی علامت سمجھ کر طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاشرتی حدود و قیود میں بعض اوقات کچھ باتوں کا اظہار یا اقرار واضح اور صاف لفظوں میں ممکن نہیں ہوتا۔ جس سے غصہ، نفرت اور طنز قومی سطح پر نشو ونما پاتے ہیں۔ براہِ راست یا بالواسطہ اظہار نہ پا سکنے کی وجہ سے انسان کے دل میں پنپنے میں معاشرہ کی اکثریت جس چیز کو ناپسند کرتی ہے، وہی طنز کا ہدف بھی قرار پاتے ہیں۔ یا پھر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاص انسان یا شے کو سامنے رکھ کر معاشرہ کے مجموعی رویوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ''ہجو'' خالصتاً شخصی ہے جبکہ اس کے برعکس ''طنز'' غیر شخصی ہوتا ہے۔ اگرچہ طنز کی اساس نفی پر ہوتی ہے لیکن اس کی تاثیر مثبت ہوتی ہے۔ اسی باعث یہ اجتماعی مفاد سے مشروط نظر آتی ہے اور یوں معاشرہ میں مثبت رویوں کو تقویت ملتی ہے اور صحت مندانہ رجحانات فروغ پاتے ہیں۔

طنز کو ہومیو پیتھک طریقہ علاج بھی کہا جاتا ہے ''یعنی زہر کا تریاق زہر''۔

فکاہی ادب کا ایک پہلو ''لطائف'' کی صورت میں بھی ملتا ہے۔ کسی قوم کے اجتماعی امراض کی تشخیص تو اس کے طنز سے ہو سکتی ہے۔ جبکہ لطیفوں کا نفسیاتی مطالعہ پاکستانی قوم کے اجتماعی مسائل اور کئی دوسرے امور کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمارے ہاں جبر اور گھٹن کی جو مجموعی فضا ملتی ہے اس کی وجہ سے کئی طرح کے لطیفے معرضِ وجود میں آئے لطیفے کے اندازِ بیاں میں لطافت بھی ملتی ہے اور کرختگی بھی۔ ان لطائف کی اساس کیسے کیسے المیوں پر استوار ہے اس کا اندازہ لگانا دشوار نہ ہوگا۔ آپ کو یہ بتانے کی ضرورت تو نہ ہوگی کہ بعض اوقات ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے فکاہی ادب اور اس کے اجزاء کا مختصر جائزہ لیا جن سے مل کر یہ وجود پاتا ہے۔

حیاتیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اعصابی تناؤ پر ان کا خاصا گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ جسم تناؤ سے چھٹکارا پانے کے لیے جو متنوع ذرائع اپناتا ہے ہنسی بھی ان میں سے ایک ہے۔ ایک عضویاتی تناؤ سے اظہار کے لیے بعض اوقات خالی پیٹ کو طنز اور بھرے معدہ کو مزاح سے مشروط کیا جاتا ہے۔

اسی طنز، مزاح اور لطائف کی روشنی میں کسی حد تک اس قوم کے اجتماعی رویوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بعض لطائف میں تو استعاروں کی سی بلاغت نظر آتی ہے اور لوک گیتوں کی طرح ان کے خالق بھی نامعلوم ہوتے ہیں۔ یہ لطائف بے وجہ نہیں ہوتے بلکہ قہقہوں کی صورت میں اجتماعی نفرت کا کتھارسس کرتے ہوئے معاشرہ میں ہوش مندی کی زیریں لہر بھی جاری کرتے ہیں۔

طنز و مزاح چونکہ قلم سے جنم لیتے ہیں اور قلم سے جنم لینے والا طنز و مزاح شعوری کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس لیے صورتِ حال اور واقعہ کے ساتھ ساتھ اسلوب کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے شاعروں اور افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ بڑے مزاح نگاروں اور طنز نگاروں کا بھی تاریخ ادب میں ذکر ہوتا ہے۔

اردو ادب میں سب سے پہلی دو نمایاں مثالیں جو ہمیں ملتی ہیں، وہ ہیں مرزا اسد اللہ غالب کے ''خطوط غالب'' اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ''فسانۂ آزاد''۔ اگرچہ یہ دونوں طنز و مزاح کی پرکشش اور جدت لیے ہوئے منفرد اسلوب اور انداز کی بہت خوبصورت مثالیں ہیں لیکن اس کے باوجود انفرادی ہیں۔ سرسید احمد خاں کی مخالفت میں طنز و مزاح کے جس انداز نے جنم لیا وہ لکھنے والوں کی انفرادیت کے باوجود بلحاظِ مقاصد اجتماع تھا۔ اس سے قبل ہمیں سودا کی ہجویات ملتی ہیں جو محض انفرادی غصہ و ناراضگی کا اظہار ہے۔ جبکہ اکبرالہ آبادی کا طنز سودا کی طرح ذاتی غصہ کی تسکین کے برعکس قوم کو اجتماعی خطرہ کا احساس دلانے کے لیے تھا۔

اودھ پنچ کو لکھنؤ سے منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں جاری کیا جس کو آنے والی نصف صدی کی صحافتِ طنز و مزاح کی صورت میں ''اودھ پنچ'' یا اسی نوع کے دیگر پنچوں پر مشتمل قرار دی جا سکتی ہے۔

تھے کیک کی فکر میں، سو روٹی بھی گئی
چاہی تھی شے بڑی، سو چھوٹی بھی گئی

اردو شاعری میں طنز و مزاح کی تیسری رو کے نمائندے نظیر اکبر آبادی ہیں۔ پاکستان میں دیگر اصنافِ ادب کی طرح طنز و مزاح کے ضمن میں بھی خاصا کام ہوا ہے۔ جن شعراء نے خود کو صرف طنز و مزاح لکھنے کے لیے خود کو مخصوص رکھا۔ ان کی تعداد بھی خاصی ہے، جن میں سید ضمیر جعفری، سید محمد جعفری، مجید لاہوری، انور مسعود، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے خاص طور پر شہرت پائی۔

جو چوٹ بھی لگی وہ پہلے سے بڑھ کے تھی
ہر ضرب کربناک پہ میں تلملا اُٹھا
پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا
بل اتنے مل گئے ہیں کہ میں بلبلا اُٹھا

(انور مسعود)

غزل

یہ بات کافی ہے، لگ گئے ہو
پھر ایسے یا ویسے لگ گئے ہو
ابھی تو خیر آئے بھی نہیں تم
جو اس طرح جانے لگ گئے ہو
یہ کام ایک آدمی کا تھا ، اور
یہاں پہ تم سارے لگ گئے ہو
تمھیں لگانا تھا اپنے پیچھے
مگر مرے آگے لگ گئے ہو
مجھے تو کوئی شبہ نہیں ہے
وضاحتیں دینے لگ گئے ہو
حساب کر کے ملے گا کیا پھر
زیادہ یا تھوڑے لگ گئے ہو
لگانا تھا پانچ سات میں تو
بس ایک میں آدھے لگ گئے ہو
ارے میاں خیر تو ہے نا سب
جو بار بار آنے لگ گئے ہو
تمھیں کوئی اور نہیں ملا کیا
ہمارے ہی پیچھے لگ گئے ہو
جہاں نہیں لگنا چاہیے تھا
وہاں پہ کُل کیسے لگ گئے ہو

گل فراز، ہڈالی

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

''اک دورِ محبت بیت گیا''-حرفِ اعتراف

مسلم شمیم/کراچی

شعری مجموعہ 'اک دورِ محبت بیت گیا' جناب مظفر حسن منصور کے سفرِ تخلیق کا تا حال بیانیہ ہے۔ ان کے اپنے بیان یعنی ''حرفِ آغاز'' کے مطابق ان کا سنہ پیدائش ۱۹۴۱ء ہے اور ۲۰۰۲ء میں ساٹھ سال کی عمر طبعی میں شعبہ تدریس سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج جوہر آباد سے ریٹائر ہوئے۔ گویا موصوف ستر کی دہائی میں ہیں اور یہ مجموعہ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔ ان کی تخلیقی زندگی کا خاصا عرصہ گزرا ہے۔ مگر انھوں نے مجموعہ کلام کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر سے کام لیا ہے۔ اسے ان کی بالغ نظری کہا جانا چاہیے۔ کیونکہ عام طور پر یہ چند سال کی شعری مشقِ سخن کو شائع کرنا عام بات ہے۔ اس حوالے سے ایک بڑے معتبر شاعر جون ایلیا کا پہلا شائع شدہ شعری مجموعہ 'شاید' ۱۹۹۰ء کی دہائی میں کم و بیش اتنے ہی عرصہ تخلیق پر محیط ہے۔ لہٰذا مظفر حسن منصور کو اس باب میں جون ایلیا کے قبیلے کا رکن کہنا غلط نہ ہوگا۔ پیشِ نظر اُن کا مجموعہ کلام 'اک دور محبت بیت گیا' کی تخلیقات کا مطالعہ قاری کو کسی تشنگی اور کہنگی سے دوچار نہیں کرتا بلکہ صفحہ اول سے صفحہ آخر تک شعری جمالیات کے طلسم کی جلوہ گری اور جلوہ سامانی کی حامل تخلیقات قاری کی تمام تر توجہ اپنی جانب مبذول کیے رکھتی ہیں۔ تخلیقات کے معیارات و محاسن کے حوالے سے مثبت تاثرات سے قاری کے دوچار رہنے کو میرے نزدیک ذوقِ مطالعہ کا تقاضا کہنا چاہیے۔

زیرِ نظر مجموعے میں غزل کے علاوہ مختلف اصنافِ سخن کی تخلیقات شامل ہیں۔ مختلف موضوعات پر پابند اور غیر پابند نظموں کے علاوہ رباعیات، فردیات اور قطعات شامل مجموعہ کلام ہیں۔ مگر مجموعی طور پر یہ مجموعہ غزلوں کا مجموعہ ہے اور یہاں صنف غزل کے سفرِ ارتقا کے مختلف مراحل اور ادوار کی جلوہ گری دیکھی جاسکتی ہے۔ صنف غزل کے سفرِ ارتقا کے حوالے سے کچھ منفی اور مثبت نظریے تاریخ ادب کے اہم ابواب ہیں۔ اس ضمن میں مولانا الطاف حسین حالی کا ''مقدمہ شعر و شاعری'' اولین بڑا حوالہ ہے۔ انھوں نے صنف غزل کے انیسویں صدی تک کے اثاثے کی عمومی نوعیت اور خصوصیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غزل کے حوالے سے اپنے شدید تحفظات کا اظہار کیا ہے اور صنفِ غزل کی عمومی مصنوعی دنیا جس میں مخصوص استعارات اور علامات اور چند سو مخصوص الفاظ اور تراکیب کی پیروی اور پاس داری کو حاصلِ فکر و فن قرار دیا جاتا اس عہد کے بیش تر شعرا کا وتیرہ رہا جس کے تناظر میں حالی نے صنف غزل کو ہدفِ تنقید بنایا اور یہ فرمادیا:

جب سے دلِ زندہ! تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

اور کسی اور زاویۂ نگاہ سے کلیم الدین احمد نے ترکِ غزل گوئی کے حوالے سے اپنی کتاب 'اردو شاعری پر ایک نظر' میں غزل کو اردو شاعری کی جان کہنے کے باوجود اسے نیم وحشی صنف قرار دیا۔ انھوں نے یہ رائے غزل کی ہیئت کو پیشِ نظر رکھ کر اور مطلع اور مقطع کے اشعار میں تاثر کے فقدان کے حوالے سے نہیں کی بلکہ غزل کے اشعار میں تضادِ فکر و نظر اور متضاد جذبو و احساس کا انھوں نے خصوصی طور پر بالتفصیل بیان کیا ہے۔ غزل کو رشید احمد صدیقی نے اردو شاعری کی آبرو قرار دیا۔ یہ جملہ ہائے معترضہ صنف غزل کے حوالے سے میں نے بیان کیے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ پیشِ نظر مجموعہ کلام 'اک دورِ محبت بیت گیا' کی غزلوں کے اشعار میں تاثر اور تفہیم کے حوالے سے کسی تضاد و تصادم کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص فضا کی ہم آہنگی قاری کو میسر رہتی ہے۔ اس مرحلے پر مجموعے کی ابتدائی غزل کے چند اشعار نذرِ قارئین ہیں:

اس دشت میں ہیں آبلہ پا دور دور تک
جاری ہے سلسبیلِ وفا دور دور تک
کھلتے نہیں کسی پہ مری خامشی کے بھید
پھیلا ہوا ہے کوہِ ندا دور دور تک
ہے ہیچ میرا ذوقِ سفر ان کے سامنے
میں جن کے ساتھ ساتھ گیا دور دور تک
زُلفوں کی چاندنی ہے نہ حُسن نظر کی دھوپ
گل ہے نہ کوئی برگِ نوا دور دور تک
ایسا نہ ہو کہ در پئے آزار ہو جہاں
اے روشنی طبع! نہ جا دور دور تک
منصور! اوجِ دار پہ کیا ماجرا ہوا
چھایا اُفق پہ رنگ حنا دور دور تک

ان شعروں کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی

ہے کہ اظہار اور ابلاغ کا سفر ساتھ ساتھ ہے اور ابہام کا کوئی عنصر قاری کو درپیش نہیں ہوتا۔ ہر شعر قاری کو دعوتِ فکر کے ساتھ جذبہ و احساس کی فراوانی بھی بہم کرتا ہے۔ شاعری کا وصف خاص محض موزونیت نہیں بلکہ تصور و تخیل کی کارفرمائی بتایا گیا ہے۔ شاعری کے مذکورہ وصف خاص کے حوالے سے ارسطو کی کتاب 'بوطیقا' اور مولانا الطاف حسین حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' کے مندرجات میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ شاعری کی عمومی خصوصیات، معیارات اور محاسن پر مظفر حسن منصور کی گہری نظر کے ساتھ دیگر کوائف شعری پر بھی ان کی بصیرت و بصارت کا بھرپور ادراک مجموعے کی تخلیقات کے مطالعہ نے مجھے بہم کیا۔

شاعری کی دنیا حسن و عشق کی دنیا کی نیرنگیوں کی جمالیاتی عکاسی کی معنویت سے عاری نہیں بلکہ کلیتہً اس کی حامل ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کا ایک بے مثل اور بے مثال شعر اس نکتے کی تفہیم کی غرض سے ملاحظہ کیجیے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اس شعر کے تناظر میں گفتگو کے حوالے سے مجموعہ 'اک دورِ محبت بیت گیا' کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نازشِ حور ہیں تری آنکھیں
حسن مغرور ہیں تری آنکھیں
برقِ خلف ہے اک نظر تیری
جلوۂ طور ہیں تری آنکھیں
مصحفِ حسن ہے ترا چہرہ
آیۂ نور ہیں تری آنکھیں
اپنا مضموں اشارۂ ابرو
اپنا منشور ہیں تری آنکھیں
نغمہ زن ہیں سرِ بساط غزل
جانِ منصور ہیں تری آنکھیں

علامہ اقبال کے اس شعر کی روشنی میں شاعری کو مذکورہ ''ساز'' اور ''سوزِ دروں'' کے باہمی رابطوں اور رشتوں کے وسیع تر تصورات اور تخیلات یعنی تصویرِ کائنات میں رنگ کا مشاہدہ کرنا شاعر کا منصب ٹھہرتا ہے۔ سو مظفر حسن منصور کی متعدد غزلوں کا مطالعہ علامہ کے مذکورہ شعر کی تفسیر و تعبیر فراہم کرتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کی کئی غزلوں کے اشعار اس ضمن میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

وہ سازِ غزل کی حسیں تان تھی
مرا دل تھی وہ، میرا وجدان تھی
وہ اقبال کا طرزِ احساس تھی
کہ غالب کی سوچوں کا فیضان تھی
دعائے سحر تھی وہ میرے لیے
حدیثِ وفا کا وہ عنوان تھی

اس سلسلے کی غزلوں کی خاصی تعداد شاملِ کتاب ہے جن سے شاعر کے حسن و عشق کی معاملہ بندی کی روایات کی پاس داری کے اظہار میں کلاسیکیت کی جدید حسیت کی رنگ آمیزی دیکھی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال کے مذکورہ شعر میں ''ساز'' اور ''سوزِ دروں'' کے وسیع تر تناظر میں زندگی آموز اور زندگی آمیز تخلیقات کے خوب صورت طرزِ احساس کی حامل غزلیں اور نظمیں زیرِ نظر مجموعے میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

مجموعے کے نام کے حوالے سے کچھ اظہار کے ضمن میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مجموعے کا خوب صورت نام بھرپور معنویت کا حامل ہے۔ مگر اسے مظفر حسن منصور کے کربِ ذات کے ساتھ غمِ حیات کی روشنی میں بھی ان کی تخلیقی جہات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس غزل کے مطلع:

اک دورِ محبت بیت گیا، اک دورِ محبت جاری ہے
اشکوں کا تلاطم ختم ہوا، آہوں کی مشقت جاری ہے

میں مظفر حسن منصور کی شاعری کی دنیا میں کئی نئی دنیائیں نظر آتی ہیں اور ہم عصر عہد کا شعور پورے جمالیاتی محاسن اور معیارات کے ساتھ قاری کو مطالعہ کلام میں محو رکھنے کی شعریاتی جلوہ گری بہم پہنچاتا ہے۔ ان کی ایک غزل میں احساسِ تنہائی کے اظہار کی مختلف کیفیات کا بیان قاری کو خصوصی توجہ کی دعوت دیتا ہے۔ اس غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں:

اُسے کہنا کہ تنہا رہ گیا ہوں
اکیلا تھا، اکیلا رہ گیا ہوں
مری تصویر یوں دُھندلا گئی ہے
کہ میں اب اپنا سایہ رہ گیا ہوں

اس غزل کے اشعار کے تناظر میں جہاں ان کے اظہار کی سادگی متاثر کن ہے، وہیں اظہار میں تہ داری کی فراوانی بھی قابلِ توجہ ہے۔ پورے کلام میں ان کی اپنی لفظیات کی دنیا بہت حد تک اپنی ہے اور اس میں کلاسیکیت کے ساتھ ہم عصر زندگی کے تقاضوں کی بھرپور پاس داری پائی جاتی ہے۔ ان کی لفظیات، جو گرد و پیش اور وہاں کے ماحول و معاشرہ کی نمایندگی کرتی ہیں، ان کی تخلیقیت کے حسن کی معنویت کو چار چاند لگاتی ہیں۔

مظفر حسن منصور کا تعلق ایک علمی و ادبی خانوادے سے ہے اور وہ اپنے والد گرامی حضرت

جوہر نظامی کی تربیت سے بہرہ ور رہے ہیں۔ ان کا یہ ورثہ اپنی اہمیت کا حامل ہے۔ مگر میرے نقطہ نظر میں شاعری فطرت کی ودیعت کردہ ہوتی ہے۔ تحقیق وتنقید کی دنیا کی شخصیات اپنی علمی جستجو اور جہد مسلسل سے بڑے منصب اور مقام پر فائز ہوتی ہیں، مگر شاعری کی دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں ڈھونڈی جاسکتی کہ فطرت کی عطا کے بغیر تخلیقیت کے مراحل طے کیے گئے ہوں اور وہ شاعرانہ عظمت کے حامل ٹھہرے ہوں۔ مظفر حسن منصورؔ کو اپنے خانوادے کا ورثہ میسر آنا اپنی جگہ مگر مجموعے ''اک دورِ محبت بیت گیا'' کی تخلیقات کی شاعرانہ خصوصیات، محاسن و معیارات، یہ سب کچھ فطرت کا عطا کردہ ہے اور فطرت کی ودیعت کردہ تخلیقیت کا بھرپور استفادہ زیرِ نظر مجموعے کے کلام میں قاری کو نظر آتا ہے۔ مجموعہ کلام کے نام میں ایک دورِ محبت بیت جانے کی بات کی گئی ہے۔ اس حوالے سے ایک مشہور شعر مجھے بار بار یاد آیا:

غزل اُس نے چھیڑی، مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اس شعر میں جس Nostalgia کا اظہار کیا گیا ہے، ویسا ہی کچھ تناظر زیرِ نظر مجموعے کے نام میں دیکھا جانا چاہیے۔

مظفر حسن منصورؔ کی شاعرانہ زندگی کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ مجموعے کی تخلیقات ان کی وسیع المشربی اور ان کی فکری و تخلیقی جہتوں کو متعین کرتی ہیں جو اُن کی ادبی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ٹھہرے گا۔ روایت و درایت، منقولات و معقولات اور تقلید و اجتہاد پر بھی ان کے افکار و خیالات تضاد کے بجائے توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا باعث بنے ہیں۔ ان کی تخلیقی زندگی میں یہ توازن اور ہم آہنگی ان کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کی شاعرانہ زندگی کے سفر میں مذکورہ عوامل اور محاسن اُن کے لیے مشعلِ راہ بنے ہیں اور ان کی شاعری میں روایت و تہذیب اور اپنے عصر کا نمایاں امتزاج ملتا ہے جو بہتوں کے ہاں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ ان کی شاعری یعنی غزل گوئی کی مجموعی تفہیم کی روشنی میں یہ بات کہی جانی چاہیے کہ ان کے یہاں کلاسیکیت کی روایات اور ہم عصریت کے تقاضوں کی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ ان کے لب ولہجہ میں جہاں میرؔ و غالبؔ کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، وہیں علامہ اقبال کا تفکر اور فیض احمد فیضؔ کی نغمگی اور لفظیات کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ غرض یہ کہ زیرِ نظر مجموعے کے مطالعے کا دائرہ بھی وسیع تر ہونا چاہیے اور اس کی پذیرائی بھی:

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

جدید ادب کے تذکرے

احمد عدنان طارق/ لاہور

موجودہ ادب میں تذکرہ جدید
کچھ دل میں بسائے پھرتے ہیں
محترم احمد ندیم قاسمی کو
اور کچھ جناب انور سدید

جب کبھی بستر کی سلوٹ کی بات ہوتی ہے
تو منٹو صاحب کو یاد کیا جاتا ہے
اور اُن کی ادبی کروٹ کی بات ہوتی ہے

حضرت جون ایلیا کے گلاسوں کی یاد آتی ہے
پروین شاکر کے پرسوں کی
اور سارہ شگفتہ پہ دیے دیے دلاسوں کی یاد آتی ہے

ہاں حبیب جالب کو گھسیٹا جارہا ہے
میں بات نہیں کرنا چاہتا
لیکن
شاکر شجاع آبادی کو پیٹا جارہا ہے

کیا عطاالحق قاسمی بھنور سے نکل آئے ہیں
یا ان کے پیچھے اب بھی
کچھ ان دیکھے سائے ہیں
کیا تذکرہ جدید میں اب بھی فراز ہوتے ہیں
کیا سب چوری ہوا اُن کا
یا ان کے بارے میں بھی راز ہوتے ہیں

وہ جس ملک میں بدھا کے بت توڑے گئے
وہاں فراز کے چندان کہے نغمے
چوری کر لیے گئے یا کہیں جوڑے گئے

کیا تذکرہ ادب میں فیضؔ اور غالبؔ
بہت بکنے لگے ہیں
بہت جدید ہو گئے ہیں
تو کیا میاں! بک نہیں رہے جونؔ اور جالبؔ
کل جب تابش کی بات ہوئی یا حسن عباسی کی
تو کیا تم اُن کے فن کی بات کرو گے
کسی بشریٰ کنزوری کی
یا کسی اُداسی کی

عبدالوحید بسمل۔محبتوں کا شاعر (ایک پل)

عادل سعید قریشی

شاعری کا منصب اور منشا ایک بحث طلب موضوع ہے۔ شاعری میں خط اندوزی ہو، شاعری میں مقصدیت ہو، شاعری میں موضوعاتی تنوع ہو، شاعری اعلیٰ اقدار کی ترویج کا وسیلہ بنے، شاعری اظہار ذات کا ذریعہ ہو، شاعری آمد ہو، شاعری آورد نہ ہو، شاعری زندگی کی کوکھ سے پھوٹے، شاعری حقیقت بیان ہو، شاعری اپنے معاشرے اور معاشرت کی عکاس ہو غرض یہ ہو وہ نہ ہو لیکن اہل ہنر جانتے ہیں کہ شاعری ایک ایسا آلہ ہے جس نے تمام وظائف مذکورہ کو برتا ہوا ہے اور شاعری گانے کی شے ہے شاعری میں سر ہو گا شاعری میں ترنم اور غنائیت ہو گی۔ عبدالوحید بسمل بھی شاعری کی دیوی کو کچھ یوں التماس گزارتا ہے:

اپنی چاہت کا سزا وار بنا دو مجھ کو
کچھ نہ کچھ اے مرے غم خوار! بنا دو مجھ کو
مجھ پہ کھل جائے مری ذات کا یہ سر نہاں
اے جنوں! واقف اسرار بنا دو مجھ کو
کوئی نسبت تو ہو اس شاخ چمن سے بسمل
گل کے پہلو میں چلو، خار بنا دو مجھ کو

اس پس منظر میں عبدالوحید بسمل کو یہ کہہ دینا ہے کہ بھائی تم ہندکو کے لیے بنے ہو اور اردو کے لیے نہیں۔ تو یہ شاعر بسمل کے ساتھ سراسر زیادتی ہو گی۔ بسمل پیدائشی شاعر وہ اردو میں میں بھی وہ کاروبار کرتا ہے جس کا دعوی داری ہندکو میں ہے کہ

حسین منظر جہاں دیکھوں تو میں اظہار کرتا ہوں
محبت نام ہے جس کا، وہ کاروبار کرتا ہوں

یہی کاروبار عبدالوحید بسمل کا مسلک ہے یعنی بسمل محبتی ہے، بسمل محبی ہے، بسمل دوست ہے، بسمل یار ہے اور بسمل شاعر ہے۔ اس کے سینے سے محبتوں، الفتوں، رفتوں کے جذبے امڈتے ہیں جن کو وہ شعر کے قالب میں ڈھالے جاتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کے ترفع، سوچ کی بالیدگی، فکر کی بلوغت، پیرایہ اظہار پر قدرت اور مشق سخن کی پختگی اور متانت سے اپنے قاری کو اپنے تجربہ اور مشاہدہ میں یوں شریک کرتا ہے کہ سننے والا اور پڑھنے والا اس تاثر کی ارتعاش اپنے قلب و ذہن میں محسوس کرتا ہے بالکل ویسے ہی محسوس کرتا ہے جیسے اس نے نے خود بسمل کے تار مضراب کو چھیڑا ہوتا ہے:

تمہیں یاد کرتا ہے بسمل تمہارا
بس آجاؤ اب کوئی کر کے بہانہ
تجھے میری محبت کا ہوا آکر پتا دے گی
جو میرے دل پہ گزری ہے وہ سب تجھ کو بتا دے گی

بسمل کی اردو شاعری کی کتاب ''ایک پل'' کا سب سے نمایاں موضوع ''محبت'' ہے اور محبت کے وہ مناظر اور بسمل نے دیکھے ہیں کہ وہ ''محبت کا شاعر'' بن گیا ہے۔ اس کی محبت صاف صاف پہچانی جاتی ہے کیونکہ بسمل کے شاعری کے حرف حرف سے ٹپک جو رہی ہے۔ ایسے ہی محبت کے داعی کے بارے میں استاذی صوفی عبدالرشید کا ایک شعر یوں ذہن میں آرہا ہے کہ

میری آنکھوں نے تو جلتے ہوئے منظر دیکھے ہیں
تم نے دیکھا ہی نہیں رقص شرر سے آگے

اور جنھوں نے رقص شرر سے آگے نہیں دیکھا بسمل انہی احباب اور قارئین کو اپنے ساتھ ان وادیوں، دروں اور کھلیانوں کی روشوں پر لیے چلتا ہے اور محبت کے وہ مظاہر دکھاتا ہے جس کے لیے دیدہ دل وا کرنا پڑتا ہے۔ بسمل کے سنگ یہ سفر ایک انوکھی نوع ہے کہ وہ دنیا کے حسین رخوں کی نشان دہی کرتا جاتا ہے اور کریہہ مناظر پس پردہ ہی رہنے دیتا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کو نام لے لے کر پکارتا جاتا ہے کہ

حصار ذات سے نکلو، بڑی دلکش فضائیں ہیں
محبت کے اشارے ہیں، محبت کی صدائیں ہیں

اور وہ علی الاعلان کہتا کہ

محبت میں لٹتے خزانے ہیں دل کے
مقام کفایت شعاری نہیں ہے
نصاب محبت میں چاہت، کدورت
یہ آدھی نہیں ہے، وہ ساری نہیں ہے

بسمل ''محبت'' کے جذبے کو ہی زندگی کے نصاب کی اساس جانتا ہے، وہ محبت میں اس محبت کا قائل نہیں جو زید بکر سے کرتا ہے اور سودائی بنا پھرتا ہے، اس کی محبت یہ ہے کہ زندگی میں انسان دوستی، ہمدردی، غم گساری اور بندہ پروری جیسے عظیم جذبات کو اپنایا جائے اور انہی سے جنم لینے والی اقدار کی نگہداشت کی جائے۔

محبت کی نگری بڑی معتبر ہے
خدا بھی یہیں ہے خدائی یہیں ہے
معطر فضائیں ہیں بسمل کی ہمدم
پیام محبت بھی اس سے صبا لے

بسمل کی شاعری میں وفا، محبت، عشق، الفت، چاہت، روشنی ایک ہی جذبے کے عکاس ہیں اور یہ انسان دوستی اور انسان کی دوستی کے پیامبر الفاظ ہیں۔ جو بسمل کے سینے میں موجزن جذبہ انسانیت کو ہم تک پہنچا رہے ہیں اسی لیے تو میں بسمل کو محبتوں کا شاعر لقب سے ملقب کر رہا ہوں۔

''محبتوں کا شاعر'' بسمل اپنے خیال اور بیان میں بھی ندرت فکر و بیان رکھتا ہے، وہ آشتی کے سفیر کے طور پر اپنا علم محبت اٹھائے لیے زندگی کی طرف چلا جا رہا ہے، اس نے محبت میں جنس کو شرط رکھا نہ نام کو، نہ حسب کو نہ نسب کو وہ محبت کل کا داعی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ محبت ایک مسلک حیات ہے جس کو اپنا کر ایک عام آدمی اپنی ساری ضرورتوں اور حاجتوں سے نبرد آزما ہو سکتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے دائرے میں آنے والے لوگوں کو محبت دے کر، اخلاص دکھا کر ان کے دل بھی جیت سکتا ہے، یہ ساری باتیں دین اسلام کی تعلیمات کی دین بھی ہیں۔ نبیؐ نے کہا تھا کہ سلام کا جواب دیتے وقت اگر آپ مسکرا دیں تو یہ مسکراہٹ بھی صدقہ ہے۔ اس نبی کا پیرو بسمل محبت کے دیپ جلائے جا رہا ہے نہ صرف شاعری میں بلکہ جو لوگ اس خوش مذاق اور ہنسوڑے انسان کو جانتے ہیں وہ اس کو محبت کا شاعر ماننے میں تحمل نہ کریں گے۔ کیونکہ وہ تو کہتا ہے کہ

بڑی تجھ کو محبت تھی زمانے میں اجالوں سے
اسی خاطر میں روز شب چراغ دل جلاتا ہوں

رموز عشق کی بسمل جو آگاہی نہیں رکھتے
تو دربار محبت میں وہ کب منظور ہوتے ہیں

جس بات سے دل ٹوٹے زمانے میں کسی کا
ایسی تو کوئی بات میں، یارو! نہیں کرتا
محبت جرم ہے تو پھر سزا منظور ہے مجھ کو
محبت کا جہاں میں برملا اظہار کرتا ہوں

عبدالوحید بسمل ایک زیرک اور ماہر شاعر ہے جس نے زندگی کی رنگا رنگی سے سب سے خاص موضوع چن لیا ہے۔ محبتوں کا شاعر، محبت کا اعلان کھل کر بھی کرتا ہے اور اس کی شاعری میں بین السطور بھی اسی محبت کا اظہار ملتا ہے اور بسمل جانتا ہے کہ محبت ہی محبت کو جیتتی ہے یہ ایسا جرم ہے جس کی سزا بھی محبت ہی ہے۔ وہ شاعر میں اپنے منفرد ڈکشن اور موضوع کی تنوع کے باوجود محبت کے باب میں اپنا خاص حوالہ بنا چکا ہے۔ یہ حوالہ ''ایک پل'' میں نہیں بنتا لیکن ''ایک پل'' میں ظاہر ضرور ہو جاتا ہے۔

انتقال پر ملال

گزشتہ دنوں معروف شاعرہ، کالم نویس اور ماہنامہ ارژنگ کی مدیرہ لبنیٰ صفدر کی والدہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم رنج و غم کی اس گھڑی میں اُن کے ساتھ برابر کی شریک ہے اور دُعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

محمد اقبال پیام شجاع آبادی

اسباب یہی ہے یہی سامان ہمارا
چڑیوں سے مہکتا رہے دالان ہمارا
ہر شخص کو خوشحالی کی دیتے ہیں دُعائیں
ہر شخص ہی کر جاتا ہے نقصان ہمارا
ہر شخص ہی کیوں اس کو مٹانے پہ تلا ہے
دیواروں پہ لکھا ہوا پیمان ہمارا
پیتے ہیں فقط ساتھ نبھانے کے لیے ہم
ہر شام کو غم ہوتا ہے مہمان ہمارا
رہنا ہے کسی اور کے قبضے میں ہمیشہ
بھر سکتا نہیں کوئی بھی تاوان ہمارا
اس بات کا دُکھ ہے کہ اشارہ نہیں کاٹا
ہر موڑ پہ ہوتا رہا چالان ہمارا
ہر روز پڑے ہوتے ہیں سب پھول زمیں پر
یہ کون گرا دیتا ہے گلدان ہمارا

ایم۔ زیڈ۔ کنول

ایسے گلشن میں اپنا گزارا نہیں
جس کے خاروں پہ بھی حق ہمارا نہیں
سر پٹکتے ہوئے وہ بگولے ملے
ریگزاروں کا جن کو سہارا نہیں
پھونک ڈالا جنوں نے ہی خرمن مرا
اب کوئی بھی خرد کا شرارا نہیں
درد پہلو میں اپنے جگاتی رہی
سوتی یادوں کو میں نے پکارا نہیں
رقص کرتی ملیں چار سُو ظلمتیں
بے کراں روشنی کا کنارا نہیں
جھیل میں جو کنولؔ نے دکھایا سماں
چشم ساگر میں ایسا نظارا نہیں

روکو مجھے اے جانِ جہاں لے چلا مجھے
ٹھہراؤ زندگی کا کہاں لے چلا مجھے
دنیا کی ہے خبر نہ مجھے اپنا کچھ پتہ
میرا وفورِ شوق جہاں لے چلا مجھے
مہلت مجھے ملی ہی کہاں سوچتی میں کچھ
ہر لحظہ بڑھتا جی کا زیاں لے چلا مجھے
منظر میں وہ فسوں تھا میں پتھر کی ہو گئی
حیرت کدے کا اُف وہ سماں لے چلا مجھے
اب تیری ذات پر سے یقیں میرا اُٹھ چکا
اب تیری سمت وہم و گماں لے چلا مجھے
کچھ دیر تک تو رو کے رہی مجھ کو اس کی لو
اور پھر چراغِ شب کا دھواں لے چلا مجھے
آیا کوئی پیام بیاباں کی سمت سے
اور ساتھ اپنے رقصِ کناں لے چلا مجھے
خوبی میں اس بیان کی پرکھوں گی پھر کبھی
لیکن ابھی تو حُسنِ بیاں لے چلا مجھے
کارِ جنوں بھی لے کے جہاں تک نہ جا سکا
کارِ جہاں ہی اب کے وہاں لے چلا مجھے
تائب میں ہو چکی تھی تبسم گو عشق سے
آیا ہجومِ دل زدگاں لے چلا مجھے

اگرچہ لگ رہا ہے اک لگاؤ بیچ میں ہے
مگر اک سرد مہری کا الاؤ بیچ میں ہے
دیوارِ رسم و رہ پر چھت بھی ڈالیں گے ٹھہر جا
تعلق کی دراڑوں کا بھراؤ بیچ میں ہے
نکل کر اس بدن کی قید سے کھل کر ملیں گے
ابھی چاروں عناصر کا دباؤ بیچ میں ہے
توقف رکھ زمانے تو ابھی جیتا نہیں ہے
بساطِ زندگی پہ میرا داؤ بیچ میں ہے
ابھی تجدیدِ اُلفت کا نہیں ہے کوئی امکاں
ترو تازہ ابھی تک دل کا گھاؤ بیچ میں ہے
نجابت مٹ چکی ہوتی جہاں سے پر ابھی تک
رواداری، شرافت، رکھ رکھاؤ بیچ میں ہے
نگلتے ہی مجھے ممکن ہے اس کا زور ٹوٹے
ابھی مغرور ہے طوفاں کہ ناؤ بیچ میں ہے
ہوس کا اور خود غرضی کا سودا ہو چکا ہے
وفا کی جنس کا پر بھاؤ تاؤ بیچ میں ہے
جہاں کے سامنے گو ہنس کے ملتے ہیں تبسم
ہمیں معلوم ہے کہ اک کھنچاؤ بیچ میں ہے

ایک حد سے تو سوا اب میں نہیں کر سکتی
اور اس دل کا برا اب میں نہیں کر سکتی
غیرتِ حُسن ہے اب میری جبیں پر قابض
سجدۂ عشق ادا اب میں نہیں کر سکتی
تجھ سے تو منصبِ آدم بھی سنبھالا نہ گیا
جانِ جاں تجھ کو خدا اب میں نہیں کر سکتی
اور محبت کی اداکاری نہ ہوگی اے دل
ہاتھ مت جوڑ، ہٹا، اب میں نہیں کر سکتی
جب بھرے زخم اور اک زخم لگا لوں خود کو
درد سے خود کو جدا اب میں نہیں کر سکتی
اپنی شرطوں پہ کیا ترکِ تعلق تو نے
ہے جو متروک، روا اب میں نہیں کر سکتی
ایسا تڑپایا ہے زخموں کے ہرے پن نے مجھے
کشتِ اُلفت کو ہرا اب میں نہیں کر سکتی
میں بکھیروں بھی تبسم جو غزل کی مہکار
اس کثافت کو صبا اب میں نہیں کر سکتی

جو بپھرتے سمندروں میں ہے
خُو وہی ہم سے سرپھروں میں ہے
وحشتیں ہم کو تھکنے کب دیں گی
اک جنوں جب تلک سروں میں ہے
میں قفس ساتھ لے کے اُڑ جاؤں
اتنی طاقت مرے پروں میں ہے
خاک پر رہ کے ربط گردوں سے
شان یہ ہم قلندروں میں ہے
اس کی آنکھوں میں لو محبت کی
اک دیا جیسے مندروں میں ہے
کر دے پندار داد پر قرباں
ایسا طبقہ بھی شاعروں میں ہے
ڈھا دیے جس نے بت مراسم کے
نام اُس کا بھی آذروں میں ہے
عشق جب سے ہوا تبسم کو
مومنوں میں نہ کافروں میں ہے

ہمارے شہر کا نوحہ جہاں لکھا جائے
تو سرخ رنگ سے بس الاماں لکھا جائے
کہوں گی اس کو ہی منزل جہاں میں تھک کے گری
کہ کیوں سفر کو مرے رائگاں لکھا جائے
تو دردِ ہجر کو کیا راحتِ وصال لکھوں؟
تو کیا سراب کو آبِ رواں لکھا جائے؟
مزہ تو جب ہے کہ بن جائے وہ جگہ صحرا
فسانہ وحشتِ دل کا جہاں لکھا جائے

درویش بارگاہِ خدا پر نہیں رہا
اب اس کا انحصار جزا پر نہیں رہا
اک چشمِ خوش گمان چراغوں میں بجھ گئی
اور داغِ انتظار قباء پر نہیں رہا
وہ جانبِ سکوتِ بیابان ہو گیا
جو راہ گیر میری صدا پر نہیں رہا
بے خواب سی نگاہ مجھے دیکھنے تو دے
یہ کس کا نام دستِ عطا پر نہیں رہا

باعثِ اجر پسِ روزِ جزا ہے بھی نہیں
ہو بھی سکتا ہے خدا اور خدا ہے بھی نہیں
میں میسر تھا اسے اور میسر کے لیے
اس زمانے میں کوئی خاص جگہ ہے بھی نہیں
ایک تو سانس میں اٹکا ہے کوئی سنگ سیہ
دوسرا سطحِ سمندر پہ ہوا ہے بھی نہیں
اتنے پیوند ہیں اسرارِ فقیری پہ کہ اب
صاحبِ فقر کو احساسِ قباء ہے بھی نہیں
ندرتِ خواب ہے آواز کے سائے میں کہیں
اور اس خوابِ قدیمی کو پتہ ہے بھی نہیں

کوزہ گر تیرے گھرانے کے لیے کچھ نہیں ہے
آج مٹی سے بنانے کے لیے کچھ نہیں ہے
مجھ کو دفنائے ہوئے لوگ ملا کرتے ہیں
جو بتاتے ہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے
بیٹھتا اُٹھتا ہوں میں اتنے زمانوں میں کہ اب
میرے اپنے ہی زمانے کے لیے کچھ نہیں ہے
مجھ کو اندر سے پڑا چور اکیلے پن کا
اس لیے شور مچانے کے لیے کچھ نہیں ہے

صورتِ گوشۂ پوشاک ہوئے پاک ہوئے
ہم چراغوں کے لیے طاق ہوئے پاک ہوئے
جانے کس سمت لیے پھرتا فقیری کا غرور
دوستو! شکر ہے ہم خاک ہوئے پاک ہوئے
یہ مدینہ ہے یہاں رنج و الم کوئی نہیں
جو گنہ گار بھی عشاق ہوئے پاک ہوئے
جو اترتے ہی نہ تھے دل کے ترازو پہ کھرے
وہ بھی جب دیدۂ نمناک ہوئے پاک ہوئے

صرف دریا میں بہانے کے لیے ہوتے ہیں
کچھ دیے ایک گھرانے کے لیے ہوتے ہیں
جھولتے رہتے ہیں تعویذ سرِ شاخِ بدن
یہ مسافر کو بلانے کے لیے ہوتے ہیں
جیسے کچھ خواب بھلے لگتے ہیں بینائی کو
ویسے کچھ خواب ڈرانے کے لیے ہوتے ہیں
حالتِ بے سروسامانی اُٹھائے ہوئے لوگ
راز کی بات بتانے کے لیے ہوتے ہیں
جن سے ملنے کی کبھی دل کو تمنا ہی نہ ہو
ایسے کردار فسانے کے لیے ہوتے ہیں
ہم فقیروں کی طرف دیکھ گزرنے والے
ہم یہیں راہ دکھانے کے لیے ہوتے ہیں

یہاں کے بعد وہاں بھی قیام ہونا تھا
خدا کے ساتھ ہمارا کلام ہونا تھا
یہ غار اور مدینہ کی سمت جلتا چراغ
اک انتظار میں یہ اہتمام ہونا تھا
اور اس خرابے کی افسردگی بتاتی تھی
کہ اس خرابے نے اک دن تمام ہونا تھا
وہ بادشاہ تھا جو شخص مجھ سے پہلے تھا
میں آخری ہوں کہ جس نے غلام ہونا تھا
میں درمیان میں حائل ہوا وگرنہ یہاں
کسی فرشتہ نے عالی مقام ہونا تھا

وجودِ مست ہے اور اسم کا مجاور ہے
یہ کشفِ خواب کسی اصل کے برابر ہے
یہ گونج اور سمندر پہ جاگتی آنکھیں
شروعِ ذات سے پہلے کا ایک منظر ہے
میں دیکھتا ہوں جہاں کوئی دوسرا مجھ سا
وہ آئینہ بھی مرے آئینے کے اندر ہے
عجیب موجہ اسرار ہے کہ دریا میں
کنارہ پاؤں میں آتا ہوا سمندر ہے

برنگِ آب کوئی بہہ رہا ہے دریا میں
مرے علاوہ بھی اک دوسرا ہے دریا میں
میں اپنی ناؤ کنارے پہ باندھ آیا ہوں
وہ اس لیے کہ کنارہ پڑا ہے دریا میں
سیاہ ڈوبنے والی ہے شاہ زادی کی
اگرچہ بیچ کہیں راستہ ہے دریا میں
میں دوستوں کا دعاؤں میں ذکر کرتا ہوں
اور ان دعاؤں سے اک رابطہ ہے دریا میں
سفید پھول اُترتے ہیں آیتیں پڑھتے
یہ میرا خواب ہے یا ملگجہ ہے دریا میں

شیش محل جیسا بنگلہ

یونس جاوید/لاہور

کسی نے زور سے پکارا..... ''چوہدری صاحب'' جس شخص نے مڑ کر دیکھا، وہ میرا جانا پہچانا نور دین..... المعروف نورا تھا۔ جس کے گنجے سر پر میلے کچیلے سرخ پٹکے کی جگہ قراقلی ٹوپی اور بدن پر بوسیدہ چیتھڑوں کے بجائے نفیس گرم سوٹ، سنہری کف لنکس اور چمکدار ٹائی دیکھ کر میں لمحے بھر کے لیے بوکھلا گیا۔

وہ ایک کھمبے کے نیچے مالٹوں والی ریڑھی کے قریب کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں امپورٹڈ سگرٹوں کا ٹن تھا جس کے اوپر سنہری لائٹر اس کے انگوٹھے تلے یوں جگمگا رہا تھا کہ اس سونے کے لائٹر کو شاید اسی نمائشی پرپز کے لیے خریدا گیا تھا..... میں ذرا سا قریب ہوا تو دیکھا اس کے چہرے سے چیچک کے داغ مٹ چکے تھے اور بوسکی کی قمیص کا کالر بھی ضرورت سے زیادہ لمبا بنوایا گیا تھا..... شاید سوا تین انچ سے بھی کچھ زیادہ! وہ بڑی خوبصورتی سے ٹن سے سگرٹ نکالتا اور تجزیہ کارانہ انداز میں سلگا کر دو چار کش لیتا اور بقیہ آدھے سے زیادہ بچا ہوا ٹکڑا دور پھینک دیتا.....

''چوہدری صاحب'' سن کر وہ لمحہ بھر رکا، آواز دینے والے کی طرف دیکھا اور چپ چاپ پچاس کا نوٹ اس کی طرف پھینک کر مذکورہ شخص کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے ادھورا سگرٹ تانگوں کے اڈے کے آس پاس بیٹھے ہوئے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کے درمیان پھینک دیا جو ذرا دیر پہلے..... بونڈ..... کپڑے کی لیروں پہ پھیلا کر سونگھتے اور نشے سے کھل کھل اٹھتے تھے..... سگرٹ پکڑنے کے لیے یہ لڑکے بڑے داؤ پیچ لگاتے اور جب کسی نہ کسی کے حصے میں یہ ٹکڑا..... چلا جاتا تو وہ فوراً مسکرانے لگتا۔

سب بچے بروکن ہاؤسز کے بچے تھے۔ یقیناً بوٹ پالش، تیل مالش اور گداگری ان کے لیے رزق حلال اور بونڈ کے نشے کے لیے کافی تھی۔ مگر اعلیٰ ادھورے سگرٹوں کے لیے بھی وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے تھے کبھی کبھی یہ ٹکڑا کسی ایک کی ملکیت ہونے سے پہلے ہی کیچڑ نما بھدے ہاتھوں میں مسلا جاتا، تب نورے کی مسکراہٹ قہقہہ بن جاتی اور وہ..... نیا سگرٹ نکال لیتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا سڑک کے کنارے گرین بیلٹ میں آ گیا اور بنچ پر بیٹھ کر سستانے لگا۔

مجھے یاد آیا..... نورے سے میری پہلی ملاقات اُن دنوں ہوئی تھی..... جب سینماؤں میں ٹکٹ خریدنا ایک معرکہ ہوتا تھا۔ لمبی قطاریں، ہزار ہا تماشائی اور رونق ہی رونق۔ ڈاکہ، نہ دہشت گردی، کوئی دھماکا نہ تڑتڑتڑ..... اصل دھماکا فلم کا ہوا..... کرتا..... پاس یا فیل..... تماشائی ساڑھے چھ کے شو سے پہلے فیصلہ دے دیتے۔

ہماری ملاقات، مجھے یاد ہے..... رتن سینما کے سامنے ہوئی تھی۔ کوئی زبردست فلم لگی تھی کہ لان کے اندر جانے تک کا حوصلہ نہ ہو رہا تھا۔ نورا اس وقت میلی دھوتی اور کھدر کا کرتہ پہنے تھا۔ جس کا رنگ بتانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی چھوٹی اور ٹمٹماتی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو دلفریب عورت کے کوکے میں لگے ہیرے کی یاد دلاتی ہے۔ وہ..... نگاہ کرتا تو دوسرے کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا۔ اس وقت وہ مسکرا بھی رہا تھا..... لگتا ہے ٹکٹ لینے والوں کی لمبی بے ہنگم قطار کو دیکھ دیکھ کر وہ جی جی اٹھتا ہے۔

فلم کو لگے دو ہی دن ہوئے تھے۔ اس لیے قطار میں نیلی پیلی قمیصوں اور بڑھی ہوئی شیو والوں کا گویا ایک سیلاب تھا۔ لمبی اور ٹیڑھی میڑھی قطاریں آپس میں الجھ رہی تھیں، عجب منظر تھا میں ساجد کے ساتھ اس فلم کی ٹکٹ لینے آیا تھا..... مگر یہ سب دیکھ کر ہمت ہار بیٹھا تھا اور واپسی کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ ساجد نے پوچھا ''اسے جانتے ہو؟'' پھر خود ہی بولا ''نورا بلیکیا ہے، نمبرون بلیکیا..... لکشمی کے تین سینماؤں میں اسی کی چلتی ہے۔'' میں نے یوں نورے کی طرف دیکھا..... جیسے ہم کسی بڑے فلم ایکٹر کو دیکھا کرتے تھے..... میری نگاہ مسلسل اس کی مسکراہٹ پر تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے آگے بڑھا..... اور تماشائیوں کے پھیلتے ہوئے ہجوم میں ڈوب گیا۔

ٹکٹ ملنے کا گجر کیا بجا، بھونچال آ گیا تھا۔ بل کھاتی کمزور لوگوں کی لمبی قطاریں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ کھوئے سے کھوا پہلے ہی چھل رہا تھا، شور مچا، افراتفری پھیل گئی کہ ساجد بھی مجھ سے بچھڑ کر ہجوم میں گم ہو گیا۔ بکنگ کی کھڑکی پر لوگ شہد کی ایسی مکھیوں کی طرح غوطے لگانے لگے تھے جن کا چھتہ اتارنے کی کوشش کی گئی ہو۔ پہلے قمیضیں اتریں، پھر لنگوٹ کسے گئے اور ہر ہمت والا ہنر مند کھڑکی کے اوپر سے زبردست چھلانگ لگانے لگا جیسے کسی نہر میں پُل سے چھلانگ لگاتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ اس کے نیچے نحیف اور کمزور لوگوں کی جھالر پس رہی ہے..... وہ شور مچا رہے ہیں، کراہ رہے ہیں..... بلبلا رہے ہیں مگر پروا کسے تھی۔ کمزور لوگوں نے خود ہی چیخ چلا کر مورچہ چھوڑ دیا اور غوطہ خور من مانی کرنے لگے..... جن کا سرغنہ شاید نورا ہی تھا.....

میں بے ہمت سا دور کھڑا حسرت بھری نگاہ سے کھڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا..... نورا نام کا شخص تیسری مرتبہ غوطہ زن ہے اس نے تیسری مرتبہ مٹھی بھر نکٹیں بھی لے لیں۔ مگر جب دھما چوکڑی میں اسکی ایک دوسرے جگے سے ٹھن گئی تو جگے نے نورے کے جبڑوں پر گھونسہ جما دیا۔

''جیرے..... اوئے جیرے پتا سے؟'' نورے نے بلبلا کر ساتھی کو آواز دی مگر جیرا اس وقت آواز کی

دسترس میں نہیں تھا۔ نورے کے ایک ہاتھ میں تیل اور پسینے میں بھیگا ہوا کھدر کا کرتہ تھا اور دوسرے میں اپنے سامنے تنے ہوئے جگے کا گریبان اور منہ میں ٹکٹوں کا ملغوبہ۔ وہ اپنی بے بسی پر اس لیے حیرت زدہ تھا کہ جگا کافی مضبوط لگتا تھا اسے۔

اس نے مجبوراً مجھے پاس کھڑا دیکھ کر اپنا کرتہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''ذرا پکڑنا باؤ..... میں اس بہن کے یار کو دسوں'' اس نے محلاتی اردو بولنے کی کوشش کی۔

سیاہ فام جگا بھی چلا رہا تھا.....

''کنجر کی اولاد..... تین مرتبہ کھڑکی تک پہنچا۔ تم نے ہتھ جوڑی سے دھکا دیا..... حرامی.....''

نورے نے اس کے جبڑے پر گھونسہ جماتے ہوئے کہا ''سور کے پتر..... مجھ کو گالی کڈتا ہے..... نورے کرل کا نگ..... کو؟''

''اوئے مجھے؟..... مجھے؟..... مجھے؟.....''

ہر مجھے کے لفظ پر نورے نے زبردست مکا جما جما کر جگے کو پہلے چت کیا اور پھر بھاگ جانے پر مجبور..... وہ بھاگ کر دیوار کے پاس چلا گیا تو میدان خالی تھا..... نورا اب پھر جوتوں سمیت کودا..... لوگوں کی گردنوں کندھوں اور سروں پر، اور واپسی پر مسلی ہوئی ٹکٹوں کی کافی تعداد لے آیا۔ اس نے سانس برابر کیا اور کرتہ مجھ سے لے لیا۔ دو تین منٹ میں اس نے دھڑا دھڑ ٹکٹیں بیچ دیں اور پھر شکریہ ادا کرنے کی غرض سے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور ایک مسلی ہوئی چرمر ٹکٹ میری مٹھی میں تھما دی۔ میں نے ریٹ پوچھا تو نورا کہنے لگا ''تم سے بلیک کروں گا..... جتنے کی ہے..... بس اتنے ہی۔'' نورے سے ٹکٹ خرید کر مجھے محسوس ہوا نورا احسان فراموش بالکل نہیں۔ اس کی ٹکٹیں ختم ہو چکی تھیں اور اس کی دھوتی کے اندر لٹکتی جیب بھاری بھرکم دکھائی دینے لگی تھی جس میں آج کی کمائی تھی۔

میرا خیال تھا..... بلیک کرنے والے فلم نہیں دیکھا کرتے۔ مگر نورا مجھے ساتھ لے کر ہال میں آ گیا۔

فلم شروع ہونے سے پہلے اس نے مجھے بتایا..... کہ وہ ہفتے کے دن فلم ضرور دیکھتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا نام ''نوردین کرل کا نگ'' ہے وہ باٹا فیکٹری میں ملازم تھا اور بہترین کاریگر تھا..... مگر اسے چھانٹی کر دیا گیا اور اناڑیوں کو بھرتی کر لیا گیا..... اس سے اسے کام کرنے سے ہی نفرت ہو گئی۔ اس کی دو جوان بہنیں ہیں..... جو ابھی تک کنواری ہیں اور ماں بیوہ ہے اور بوڑھی بیمار بھی۔ اس کی نظر اس حد تک کمزور ہو چکی ہے کہ اسے اندھا ہی سمجھنا چاہئے۔ پھر وہ لمحہ بھر کچھ نہ بولا اور پھر کہنے لگا۔ ''باؤ یار ٹکٹیں بلیک کرنے سے ہی گھر کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اور ماں سمجھتی ہے نوردین..... میرا کماؤ پتر حق حلال کی روزی کماتا ہے۔'' وہ ہنسا پھر بولا ''وہ میری کمائی کو بابرکت کہتی ہے۔ اور دعائیں دیتی ہے بس اس کی دعاؤں سے اتنا ہے کہ میں جیل جانے سے بچ جاتا ہوں..... اوپر سے مولا کا کرم ہے کہ اس نے بازوؤں میں زور دے رکھا ہے۔ بازو بھی دیئے۔ زور بھی دیا۔ دونوں میں ایک نہ دیتا تو سب بیکار ہوتا۔ رازق وہی ہے، سچ ہے خواہ پتھر میں کیڑے کو دے، یا نوردین کرل کا نگ کو دے۔ بس وہ دیتا ہے..... اس نے موت، زندگی، روزی، روزگار، عزت..... ذلت..... خاص طور پر اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں..... ہیں کہ نہیں''

پردہ اٹھ چکا تھا مگر فلم ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ اس نے کالی سی کوئی چیز جیب سے نکالی اور سگرٹ کے تمباکو میں ملا کر بھر لی اور میرے سوال سے پہلے ہی بولا ''یہ تھوڑی سی ''سوات کی ٹافی'' تھی میرے پاس، بچی کھچی، بندہ تھک ٹٹ جائے تو اس کو جوڑ دیتی ہے..... ساری تھکن..... تتر بتر..... پی گئے؟'' اس نے سگرٹ سلگا لیا تھا کہ وہ دو رسینماؤں میں سگرٹ پینے والوں کا تھا۔ میں مسکرا کر چپ رہا تو اس نے دو کش لگا کر ہی آدھا سگرٹ ختم کر دیا پھر بتانے لگا.....

''سوات کی ٹافی..... مزہ تو دیتی ہے..... پر ہے بڑی کُتی شے۔'' بندے بشر کو زمین سے اٹھا کر اتنا اونچا اڑا دیتی ہے کہ بندہ'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ''توبہ توبہ توبہ، خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔ خیر بلیک میں تو اندر کبھی نہیں گیا میں..... مگر اس ٹافی نے مجھے ایک ماہ کی قید کرا دی تھی۔ دکھ اس بات کا ہے کہ میں قید میں تھا تو ماں چلی گئی..... چلو اچھا ہوا بے چاری وہ بھی تو قید ہی میں تھی..... پر اب بہنوں کی فکر زیادہ ہو گئی تھی..... جیل سے رہائی ہونے والی تھی خبر ملی..... بڑی بہن سلمٰی کو کسی نے ورغلا کر اغوا کرا دیا ہے۔ اس صدمے نے مجھے زیادہ سگرٹ پینے پر مجبور کیا۔ اور پھر دوسری سفینہ سڑک کراس کرتی کو ٹرک والا کچل کر بھاگ گیا..... اللہ اللہ خیر صلا..... مگر سچ پوچھو تو ان صدموں کو بھلانے کے لیے شراب اور سور کو گوشت بھی حلال ہو جاتے ہیں۔'' وہ چپ ہوا تو ملال میں بھیگی ایک چادر سی تن گئی ہم دونوں ہی چپ تھے۔ اور اداس!

پھر فلم شروع ہو گئی..... انٹرول تک وہ بولا نہ میں۔ میں نے دیکھا وہ بے فکر سو رہا ہے..... شاید وہ فلم دیکھنے نہیں ٹھنڈے یخ سینما ہال میں سونے آیا تھا۔ جب انٹرول ہوا تو اس نے مجھے چائے بھی پلائی، ساتھ میں کیک، آئس کریم اور جوس کی بوتلیں کہ پونے دو سو خرچ کر دیئے اور پھر یہ بھی بتایا کہ وہ اس دھندے سے بھی تھک چکا ہے، روز لڑائی مار کٹائی ہوتی ہے اور یہ ضروری ہے، بلکہ لازمی۔ مگر کاروبار کے لیے روپیہ چاہئے..... ڈھیر سارا روپیہ.....''

فلم دوبارہ شروع ہو کر ختم ہو گئی۔ نورا سوتا رہا۔ اور پھر اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت کرتے ہوئے بولا ''ابھی دو شو باقی ہیں..... دھندا ختم کر کے ہی نکلوں گا یہاں سے۔ مسکرا کر اپنی بات میں اتنا اضافہ کیا۔'' ملنے کو دل چاہے تو رات ایک بجے سے دو بجے تک ماموں کے ہوٹل میں مل جاؤں گا۔'' اور پھر وہ ہجوم میں گھل مل گیا.....

اس ملاقات کے چند روز بعد ہی میں اسے بھول چکا تھا۔ مجھے یاد تک نہ تھا کہ نورا نام کا شخص مجھے

کبھی ملا بھی تھا۔ چار سال گزر گئے..... ایک شام میں بھائی دروازے کے اندر سے گزر رہا تھا..... کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ ''مرے باشا'' میں نے مڑ کر دیکھا تو نورا لپکا آرہا تھا۔ مسکراتا ہوا..... کھلکھلاتا ہوا۔

''ارے'' میں ٹھٹھک کر رک گیا۔

وہ بولا..... ''باؤ یار..... تیرا ملنا میری خوش بختی ہوگیا۔'' میں مسکرا دیا تو اس نے اسی لہجے میں کہا ''واقعی باؤ..... مولا مشکل کشا نے مہر کردی۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے کریدا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا پہلے اسے سہلایا اور پھر مضبوطی سے پکڑ کر موڑ مڑ کر ایک گلی میں لے آیا۔ سامنے تین منزلہ پرانا مکان تھا جس کے چتکبرے فرش کی ٹائلیں اکھڑ رہی تھیں اور بڑے دروازے کے باہر ٹاٹ کا پردہ لٹکا تھا۔

نورا بلا جھجک میرا ہاتھ پکڑے اندر لے گیا۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ بچھے آبنوسی پلنگ پر دو سانولے رنگ کی دلفریب اور نمکین لڑکیاں جوان بھی حسین بھی بیٹھی تھیں ایک سویٹر بننے میں مصروف تھی دوسری فیشن پر چھپے ایک انگریزی میگزین کے ورق الٹا رہی تھی جس میں لباس سے زیادہ بدنوں کی زینتیں نمایاں کی گئی تھیں۔ نورے نے اشارے سے دونوں کو اگلے کمرے میں بھیج دیا۔

''شادی بھی ہوگئی؟'' میں نے تجسس سے نورے کی طرف دیکھا..... ''ذکر تک نہیں کیا۔''

''نہیں نہیں یہ تو میری بہنیں ہیں نگینہ اور سفینہ۔ دونوں اغوا ہوگئی تھیں میرے جیل جانے کے بعد..... لاج، شرم کیا غیرت، میرے خون میں بھی ہے..... دوسری کے لیے میں نے ہر کسی کو یہی بتایا کہ ٹرک کچل کر مارگیا..... کیا کرتا.....؟''

''ملیں کیسے؟''

''باؤ باشا''..... اس نے گلا صاف کر کے کہا ''میں بھی جمعدار لال دین کا بیٹا ہوں۔ دھونس، دھاندلی، ڈنڈا سب کا استعمال کرنا پڑا..... مگر کام تو ہوگیا نا.....''

''یار تو کھل کے بیٹھ نا''..... اور سن شریف ڈوئی اور دینو ماچھی کو چھ چھ ماہ قید دس دس ہزار روپے جرمانہ الگ، اس نے بے ڈھنگا قہقہہ لگایا..... اور پھر پتھریلی سنجیدگی سے کہنے لگا ''یار باؤ برا نہ ماننا، چار دن سے کچھ کمایا نہ کھایا۔ صرف نمکین چائے پر گزارا ہے۔ لوگ فلمیں خاک دیکھیں، ہر فلم صبح سینما میں لگتی ہے، شام کو وڈیو بازار میں آجاتا ہے۔ سارے ہال خالی، ٹکٹ کی کھڑکی ہر وقت کھلی ملتی ہے، تماشا ہے، تماشا دیکھنے والا کوئی نہیں.....''

''میں جانتا ہوں..... سب جانتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی حالانکہ اس کا گلا بھرا گیا تھا۔ اور آنکھوں میں نمی تھی اس نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا ''خود تو فاقہ برداشت کرنے کی ہمت ہے پر یار دو کڑیل جوان جثیاں..... کہاں سے بھروں ان کے پیٹ.....؟''

مجھے دکھ ہوا..... نورا سچا تھا..... کھرا تھا..... اس نے کبھی بات میں ملاوٹ نہیں کی تھی۔ یہ اس کی صفت تھی۔ میں نے جیبوں کو ٹٹولا تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر دیا۔ شاید اس سے برداشت نہ ہو رہا تھا..... بالکل یہی لگتا تھا کہ اس کے محسوسات انگارہ ہو رہے ہیں..... جنہیں وہ بیان کر سکتا ہے نہ ان کا اظہار..... تین سو دس روپے اکٹھے کر کے مجھے شرمندگی ہوئی۔ بہت کم تھے۔ پھر بھی میں نے ہمت کی اور اس کی جیب میں اڑس دیئے۔ ''میری جان''..... وہ چیخ پڑا..... ''یہ تجھے واپس لینا ہوں گے۔ قرض ہے میرے اوپر.....''

''قرض اتنا تو ہو آدمی پاؤں پر کھڑا ہو سکے یہ قرض نہیں، فکر نہ کرنا میں کچھ اور بھی کروں گا.....'' میں اٹھا تو اس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کرسی میں پوچھا ''چائے تو پیتے جاتے ایک پیالی'' ''پیونگا..... جب دوبارہ آؤں گا'' میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔ وہ مجھے دروازے کے باہر تک چھوڑنے آیا تھا..... مگر گلی کے موڑ تک چھوڑ کر گیا۔ کھڑے کھڑے دو چار سو خرچ کر دینے والے کی یہ حالت مجھ سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔ مجھے اپنی مصروفیت اور پھر کچھ اور کرنے کے عہد نے ایک مہینہ نورے کی طرف جانے نہ دیا۔ میں چاہتا تھا اس کی مدد کروں مگر دو چار ہزار بھی کم تھے تب ناں چھٹے ساتویں مہینے ساڑھے سات ہزار کا بونس ملتے ہی میں نے ڈھائی ہزار مزید شامل کیے اور بہت مسرور اور بااعتماد ہو کر ایک خنک شام گھر سے نکلا تھا۔ راستے میں میں نے اس کے لیے شاپنگ بھی کی..... تھوڑی مٹھائی..... ایک کرتہ پاجامہ، اور ایک نیا سویٹر بھی خرید لیا۔ اتنا سامان کسی ضرورت مند کے لیے اٹھا کر لے جاتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی تھی..... جو میرے لیے ایک تجربہ تھا..... زندگی میں پہلی مرتبہ! مڑی تڑی گلیوں کے موڑ کاٹ کر جب میں اس تین منزلہ مکان کے دروازے پر پہنچا..... تو اس کا حلیہ ہی بدل چکا تھا۔ پھٹے پرانے ٹاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ فرش کی ٹائلیں بدل گئی تھیں..... نیا ڈسٹمپر ہو چکا تھا اور اوپر ایک بڑا سا بورڈ آویزاں تھا جس پر پوشیدہ امراض کے علاج کے دعوے لکھے گئے تھے..... اندر حکیم جی مطب کھول کے مریضوں کی قطار سامنے بٹھائے طمطراق سے نسخے لکھ رہے تھے۔

معلوم ہوا نورا اپنا الاٹڈ مکان بیچ کر جا چکا ہے۔ مجھے واپس آتے ہوئے سامان اور مٹھائی بوجھ لگ رہے تھے اور قدم من من بھر کے۔ زیادہ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ میرے پاس اس کے لیے اپنی ہی فرم میں معقول تنخواہ والی ملازمت تھی۔ میں نے آدھا لاہور چھان مارا وہ اس شہر میں تھا ہی نہیں۔ دل اس لیے بہت گداز ہو رہا تھا..... اس کے فاقے اور آنکھوں کی نمی میرے دل پر نقش ہوگئی تھی۔

ایک سال تک میں اس کے لیے فکرمند رہا اور پھر بھول گیا۔ اور آج ساڑھے گیارہ برس بعد..... یوں اچانک وہ میرے سامنے تھا اور اس نفیس لباس میں۔ سگرٹ کے مرغولے بے وجہ اچھالتا ہوا۔ میرے اندر ہی اندر مسرت کی ایک لہر نے اٹھ کر آسودہ کر رکھا

تھا مجھے۔ میں نے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اسے آواز دی۔ وہ نام سن کر چونکا۔ گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اور چیخا...... ''اوئے میری جان کے ٹوٹے'' وہ تقریباً بھاگ کر میری طرف بڑھا اور بے ساختہ مجھ سے لپٹ گیا۔ دونوں طرف سے سوال ہی سوال تھے۔ جواب کوئی نہ تھا۔ آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں اور سگرٹوں کو لوٹنے والے بچے حیرت زدہ۔

رومال نکالتے ہوئے اس کی جیب سے نفیس وزیٹنگ کارڈ گرا جو اس نے مجھے دونوں ہاتھوں کی اوک میں رکھ کر پیش کر دیا۔ پھر ایک بلیک رنگ کی کرولا قریب آ کر رکی جس کا وہ پہلے سے منتظر تھا باوردی ڈرائیور نے تیزی سے اتر کر دروازہ کھولنا چاہا مگر نورے نے اسے پرے دھکیل دیا...... اور اپنے ہاتھ سے ادب سے دروازہ کھولا...... میرے لیے۔''

''کدھر لے جا رہے ہو؟'' میں نے بیٹھتے ہی پوچھا وہ اسی بے تکلفی سے بولا ''چھوٹے چھوٹے کام ہیں دو، پھر لنچ ہوگا۔ ہم دونوں ایک ساتھ...... اور باتیں ہوں گی مگر پہلے کوفی کا ایک دور...... او کے؟''

''او کے'' گاڑی موڑ کاٹ کر شاہراہ پر آ گئی تھی۔ او پھر فائیو سٹار کے پورچ میں...... ہم اتر گئے تو ڈرائیور بڑے سلیقے سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ عجب ہے کہ اس کا فائیو سٹار میں بیٹھنے کا انداز، سگرٹ پینے کا سلیقہ اور گفتگو کے اطوار، باڈی لینگویج سب ہی بدل چکے تھے۔ جب میں نے بے تکلف ہو کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''نورے یار......'' تو اس نے ایک لمبی ''شی ی ی'' کرتے ہوئے مجھے روک دیا، ایک دو لمحے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تکتا رہا۔ پھر بولا۔

''تم نے میرا کارڈ پڑھا نہیں شاید'' رک کر اس نے جچے ہوئے لہجے میں پورے اعتماد سے کہا ''نورادوبلہ نہیں، سید نورالدین شاہ کہو بھائی۔ اول تو زیادہ لوگ مجھے شاہ جی ہی کہتے ہیں...... بس یہی کافی ہے۔''

''اچھا شاہ جی...... کچھ بتائیں گے بھی یا نہیں کیا کاروبار ہے۔''

''کاروبار کیا تھا...... مولا نے مہر کر دی'' وہ کوفی سپ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''کون ہے جو سمگلنگ نہیں کرتا...... میں بھی کرتا ہوں۔''

''اچھا'' میں اس خلاف توقع جواب سے بوکھلا گیا تھا۔ ''خطرناک کام شروع کر دیا ہے۔؟''

''خطرہ تو راہ چلتے ہوئے بھی ہے...... قدم قدم پر دھماکا، گلی گلی ٹارگٹ کلنگ''...... رک کر وہ مسکرایا ''جان محفوظ نہ مال محفوظ نہ عزت آبرو'' رک کر اس نے بات بڑھائی...... ''تم انصاف سے کہو ہے کوئی شے...... محفوظ؟''

''سچ کہا تم نے!'' میں نے تائید کرنا چاہی مگر اس نے بات چلنے نہ دی۔ بولا ''اترسوں انڈیا جا رہا ہوں...... کل ویزہ مل جائے گا...... چلو گے......؟''

''جانا تو چاہتا ہوں...... مگر...... ویزہ کیسے ملے گا؟''

''ارے......'' وہ تیزی سے بولا...... ''ملے گا...... ضرور ملے گا...... ویزہ لینا سید نورالدین شاہ کا کام ہے، کہو، تو آج ہی بندوبست کرا دوں۔''

''تم پاسپورٹ لاؤ۔''

مجھے اس کی باتوں کا یقین نہیں آ رہا تھا...... میں نے ٹالنے کے لیے کہا ''پھر کبھی چلیں گے...... فی الحال جانے دو۔''

''ارے نہیں جان...... شام تک پاسپورٹ مجھے اسی ہوٹل میں پہنچا دینا...... یاد رکھنا روم نمبر 903...... میں یہیں ٹھہرا ہوا ہوں......''

میں سکتے میں آ گیا...... ''تم گھنٹہ بھر کمرے میں چل کر آرام کر لو، یا گھر سے پاسپورٹ لے آؤ، مگر باتیں لنچ پر ہوں'' اور وقفہ دے کر ''اصل باتیں تو جانی انڈیا جا کر ہی ہوں گی، امرتسر میں۔'' اس نے بگاڑ کر مجھے ہنسانے کی کوشش کی۔ پھر اس نے بات بدل کر پوچھا ''کمال ہے مجھے کیا معلوم تمہارے پاس وقت بھی ہے یا نہیں...... ہے نا؟''

''ہے، میں پاسپورٹ لے کر آتا ہوں۔'' میں نے فوراً حامی بھری......

''او کے...... گڈ......'' اس نے کہا اور ڈرائیور کو کال کر کے پورچ پہ بلا لیا۔ گاڑی ہوٹل سے نکلی تو نورے نے آواز ضبط کرتے ہوئے اچانک کہا ''ارے بھائی...... میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا...... کہ میری شادی ہو چکی ہے......''

''بہت...... بے حد مبارک۔''

''مبارک تو خیر ٹھیک ہے...... مگر ہے بڑی لڑاکی'' وہ مسکرایا۔

''پھر تو بڑی بری ہوئی۔''

''نہیں...... بری بھی نہیں...... کیونکہ سارا کاروبار اس کے دم سے اوپر گیا ہے'' نورے نے پہلو سمیٹ کر کہا۔

''اچھا...... گویا سمجھدار ہے پوری؟''

''سمجھ دار تو اس کا باپ بھی نہ تھا...... ابھی پرسوں تھیٹر دیکھنے گئی پرس بھول آئی۔ یقین کرنا دس تولے کا سیٹ تھا اس میں، ریٹ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا...... تقریباً دس بارہ لاکھ کا مال تھا۔''

''بڑی لاپروا ہوئی پھر تو'' میں نے نورے کو سپورٹ کرنا چاہا تو وہ نارمل ہو گیا۔

''دفعہ کرو...... یار ہے بڑی کرماں والی......''

اس نے پھر بیوی کے حق میں وزن ڈال دیا۔ دو منٹ خاموشی سے گزرے تو نورے نے ڈرائیور سے کہا۔

''اشفاق حسین، گاڑی روکو۔'' گاڑی رکی تو نورا کہنے لگا ''میں یہاں رکوں گا...... صاحب کو آگے لے جاؤ، گھر...... پھر کاغذات لے کر واپس...... اسی جگہ مجھے یہیں رک کر کال کر دینا، او کے؟''

''جی سر جی......'' اشفاق حسین نے ادب سے سر ہلایا۔

''نورا اتر گیا...... تو میں اسی گاڑی میں گھر سے کاغذات لینے چلا گیا۔ راستے بھر مجھے نورے کا متلون مزاج ہونا بھی کھلے ڈلے انداز میں کاروبار کا ذکر......

کبھی میز زاور ایٹی کیٹس کے ساتھ مہذب انداز اپنانا، کبھی بیوی کے خلاف کبھی حق میں عجیب سالگا تھا۔ مگر میں نے زیادہ اس کے بارے میں سوچا نہیں۔ کیونکہ اصل باتیں تو اس نے لنچ کے بعد تک اور انڈیا تک روک رکھی تھیں..... البتہ میں نے بغیر کچھ مزید سمجھنے کے لیے خود کو تقدیر کا قائل کیا..... اور نورالدین شاہ کی قسمت پر رشک بھی کیا۔ تقدیر اور تدبیر میں فضیلت کس کی ہے؟ شاید تقدیر ہی کی ہے یا اتفاقات کی ہے یا امکانات کی ہے۔ ان کے سامنے محنت، لگن..... سچائی..... دیانت اور ہنرمندی..... کبھی کبھی، ہار جاتے ہیں۔ جی ہاں، ہار جاتے ہیں۔ یہ درست ہے۔ اور نورے کی ایک مثال میرے سامنے تھی۔ دو تین دن بعد میں نورا، نورے کی بیوی، سالی اور سہیلی واہگہ بارڈر پر تھے۔ میرے ہی اصرار پر ہم بائی روڈ جا رہے تھے کیونکہ "امرتسر" مجھے بھی ہانٹ کرتا تھا۔ کاغذات کی پڑتال ہو چکی اور ہم گزرنے ہی والے تھے کہ ہم سے آگے جانے والی فیملی کے ایک فرد کے ہاتھ سے گرما گر کر پھٹ گیا۔ پتہ نہیں اس کے اندر سے کیا برآمد ہوا ایکسائز والوں نے سب کے سامان کی دوبارہ سے پڑتال شروع کر دی اب کے تین چار عورتیں بھی دھر لی گئیں۔ میں نے سہم کر نورے سے پوچھا "تمہارے پاس کچھ ہے؟"

"فکر مت کرو..... ہمارے پاس کیا ہوگا۔" نورا اطمینان سے بولا تھا۔

"مگر وہ سمگلنگ..... جو تم بتا رہے تھے؟"

ساری پڑتال ہوئی..... کوئی چیز نورے سے نہ اس کی بیوی سے ملی۔ اور سب خیریت سے بارڈر کراس کر گئے۔ امرتسر پہنچ کر ہم نے بھارت مسلم ہوٹل میں کمرے کرائے پر لیے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے مجھے نیند آ رہی تھی۔ میں نے چائے لی اور سو گیا۔ وہ لوگ شاپنگ اور ملنے ملانے کے لیے چلے گئے میری نیند تھی تو گہری مگر بھوک کے پیٹ درمیان میں اچٹ گئی، رات ایک بجے نورے نے دستک دی تو میری بھوک بھی چمک گئی۔

ہم دونوں کھانے پہ بیٹھے..... تو میں نے گھر والوں کا پوچھا۔ "ہاں" نورا بولا "وہ بلدیو سنگھ کے گھر رہ گئی ہیں۔ پھر وہ رک کر کہنے لگا "ہر شہر میں ہر معزز فیملی سے میری سگھڑ بیوی کی رسم و راہ ہے۔ لوگ بہت پیار دیتے ہیں۔ بلدیو سنگھ تو بٹوارے سے پہلے ہی میرا بیلی تھا، بچہ سا۔"

"تم بھی رہ جاتے وہاں....."

"میں..... میں....." لحہ بھر رک کر اس نے پانی کا گھونٹ بھرا "تمہیں اکیلا چھوڑ دیتا یار....." پھر اس نے نوالہ توڑا اور چباتے ہوئے بات بڑھائی.....

"سچ بتاؤں..... یہاں ہر شخص کے پاس پانچ مرلے کا مکان ہے۔ یا کسی مکان میں دو کمرے جاپانیوں کی طرح، ان لوگوں کے دل تو کھلے ڈھلے ہیں مگر مکان تنگ ہیں۔ اب دیکھو..... بلدیو کے پاس جگہ ہی تین مہمانوں کے لیے تھی....."

نورے نے بہت پینترے بدلے..... اس کے پاس کوئی معقول جواب تھا نہیں..... میں نے کریدنے کے بجائے کھانے پر توجہ دی اور فارغ ہو کر سو گیا۔ ہمارے پاس تین شہروں کا ویزہ تھا، امرتسر، دہلی اور بمبئے کا۔ امرتسر کم و بیش ہم دس روز ٹھہرے۔ میں اور نورا فلمیں دیکھتے، سیر سپاٹے کرتے پھر نورا اپنے دوستوں سے ملواتا..... مگر میں بور ہو رہا تھا۔ نورا ہر کسی سے ملواتے ہوئے کھسیانے پن کا مظاہرہ کرتا..... کسی قسم کی اکڑ، فخر یا رعب داب اس کے پاس نہ پھٹکتا تھا۔ ہاں مگر بھابی سے دوبارہ ملاقات ان دس دنوں میں نہ ہوئی تھی۔ وہ لوگ کبھی بلدیو سنگھ کے گھر کبھی سیٹھ سندر داس کے ہاں مہمان ہوتے جو نورے کے بقول بٹوارے سے پہلے اس کے باپ کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ تین دن بعد ہم سیٹھ سندر کی دو گاڑیوں میں دلی جا رہے تھے..... سیٹھ اور تینوں عورتیں اگلی کار میں تھے اور میں اور نورا دوسری گاری میں.....

دلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ بے پناہ آبادی کے اس شہر میں بھی اعلیٰ ترین بنگلے ہیں۔ اعلیٰ ترین فیملیز ہیں اور اونچے ٹاورز نما بلڈنگیں بھی۔ گو امبانی کے سینتالیس منزلہ اس گھر جیسا تو کوئی گھر نہیں تھا جسے امبانی نے کئی ارب ڈالر سے بمبئے میں اس لیے تعمیر کرایا ہے کہ وہ کرا سکتا ہے..... اس کا کہنا تھا بمبئے میں پولوشن بہت ہو گئی ہے اور ہم لوگ ستائیسویں منزل سے اوپر اس لیے رہیں گے کہ پولوشن کا زہر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ دلی آ کر میں بہت بے چین ہو رہا تھا..... میرا جی چاہتا کہ اڑ کر واپس چلا جاؤں..... مگر یہ ممکن نہ تھا۔ بہت آرزدہ ہو کر میں واپس آنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ مگر بہت معذرت کے ساتھ نورے نے مجھے چند دنوں کے لیے درخواست کی۔ دہلی میں سیٹھ بجامل کے بنگلے پر زبردست پارٹی تھی۔ جس میں نورے کے ساتھ مجھے بھی جانا تھا۔ پارٹی پنڈال میں داخل ہوتے ہوئے مجھے احساس ہوا یہ سب پروپیگنڈا ہے کہ برصغیر میں غربت ہی ہمہماتی ہے..... ہندوستان ہو یا پاکستان دونوں کی کئی کئی پرتیں ہیں۔ جن میں ہم رہتے ہیں، سانس لیتے ہیں، جینے کی جدوجہد کرتے ہیں وہ پرت بھی غنیمت ہے..... غربت کی لکیر کے بعد والی تین پرتیں ناقابل برداشت ہیں۔ سچ یہی ہے وہاں کے باسی سسکتے ہیں..... تڑپتے ہیں..... مرنے کی تمنا کرتے ہیں، گندا پانی بیکٹیریا سے تھل تھل کرتا ہوا ان کے جسموں میں کلبلاتی بیماریوں کے بیج بوتا ہے مگر وہ میلا چیکٹ کپڑا جوہڑ پر پھینک کر اس میں سے پانی پی کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کیڑے چھان لیے ہیں اسی پانی میں مردہ جانوروں کا گوشت ابال کر تیز مصالحے نگلنے والے بھی ہیں۔ اور مر جانے کی تمنا کرنے والے آدھی آبادی سے زیادہ ہیں..... دونوں ملکوں میں..... مراعات یافتہ اور جنہیں میں آج سیٹھ بجامل کے ہاں گاڑیوں سے اترتا ہوا دیکھ رہا تھا..... ایک فیصد سے بھی کم ہوں گے۔ یہاں ارب پتیوں کی نسلیں ہیں تو میرے وطن میں بھی ہیں..... سسکتے لوگ ادھر ہیں تو

ادھر بھی ہیں۔ ہم کتنا بھی آنکھ چرائیں..... یہ سب ہے..... یقیناً..... درندہ ادھر کا ہو یا ادھر کا درندہ ہی ہوتا ہے۔

نورا آگے بڑھ بڑھ کر سیٹھوں سے مل رہا تھا۔ خیریت پوچھ رہا تھا۔ بتا رہا تھا۔ وزیٹنگ کارڈ دے رہا تھا..... لے رہا تھا..... ہر شخص کی شان الگ تھی آن نرالی اور شراب کی پروفیوم جیسی حسین ننھی شیشیاں ہر ایک کی اپنی جیب سے برآمد ہوتیں..... اور سب کے سامنے جرعہ لیتے اور قیمتی شرابیں دوبارہ جیبوں میں چلی جاتیں پھر رقص و مستی کے دور شروع ہوئے، رنگ و نور برسنے لگا۔ سُروں کی بارش میں بدنوں کی ہر قوس نیلی پیلی اور ہری روشنیوں میں نمایاں کی گئی۔ اور ہن برسنے لگا.....

تیسری آئیٹم مہمان دیس سے آنے والے فنکاروں کے لیے مخصوص تھی۔ خاموشی چھا گئی..... اور پھر طبلے کی تھاپ پر تھرکتے بدن نمایاں ہو گئے..... ہوتے چلے گئے..... ان کے جسموں پر چڑی اور برا کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ سُر اور تالیاں ان بدنوں کو حرارت کی آخری حد تک لے جا رہی تھیں..... میں منجمد تھا۔ بالکل پتھر.....

سانس میرے اندر جا رہا تھا مگر آکسیجن نہ تھی۔ مگر پتھر پسینے سے بھیگ بھی سکتا ہے؟ جب ننگے پن اور نئے زاویوں اور اس کی نمائش سے شرابیوں نے کھل کر نوٹ برسانے شروع کیے تو نورے کے چہرے پر چاند کھل کر طلوع ہو گیا۔ مسکراہٹ اس کی باچھیں کھول کر دور تک پھیل رہی تھی۔ سامنے تینوں وہی تو تھیں۔ انیسہ، نگینہ اور نفیسہ جنہیں نورا پوی، سالی اور سہیلی کہہ کر ملوا چکا تھا..... اور جو امرتسر کے تنگ مکانوں میں بھی مہمان نوازی کا لطف اٹھا چکی تھیں۔ میں اٹھنا چاہتا تھا مگر اٹھنے کی ہرگز اجازت نہ تھی۔ دوسرے روز میں نے اس دھندے کا ذکر تک نہیں کیا..... مگر میرے چہرے پر ملال پڑھ کر نورا خود ہی بول پڑا۔

''یہ تمہارا پہلا تجربہ ہے نا..... پہلے جھوٹ کی طرح'' وہ ایک لمحہ رک کر میرا چہرہ پڑھتا رہا پھر بولا ''پہلے جھوٹ سے آدمی آدھا مر جاتا ہے..... مگر جوں جوں عادی ہوتا ہے چہرا کھل کھل اٹھتا ہے، لالیاں چہرے کا انعام ہو کر جھوٹ کو سچ کر دیتی ہیں..... بعینہٖ میں زندگی سے موت کی دہلیز تک چلا گیا تھا..... ہر دم سولی کے تختے پر گزرنے لگا اور پھر جوان جٹیوں سے جوانی سنبھلتی تھی نہ پیٹ کی آگ تب میں نے میڈم مادھوری کی منت سماجت سے پھول بہنوں کو ہنر سکھلا کر پرفیکٹ کر دیا اب ان کے پھل لانے کے موسم ہیں..... بلکہ اب تو ان کا ہر موسم ہی پھلوں سے لد رہا ہے۔'' اس نے رک کر کش لگایا اور بڑے فلسفیانہ انداز میں مخاطب ہوا۔

''بچہ جی..... اس دنیا میں دو ہی دھندے ہیں اب، ایک پیٹ کا..... ایک پیٹ سے نیچے کا..... زیادہ تر نیچے ہی کا چلتا ہے..... اور میں تو آرٹ اور ہنر کی خدمت بھی کر رہا ہوں۔''

''کیا فائدہ ایسے آرٹ کا جس میں آدمی غیرت، مردانگی، انا، اقدار اور ضمیر کا جنازہ اٹھا کر بھی شرمندگی سے نہ بچ سکے۔ اپنی گلی محلّہ ہی چھوڑ دے..... چھپ کر رہے، خوف زدہ سا۔'' میں نے کہا ''صرف برانڈی پینے اور کاروں میں سفر کرنے کے لیے؟ یہ ہے کوئی اطمینان کی بات؟''

وہ بولا ''کسی کی مجال نہیں جو کوئی چھیننے پر مجبور کرے ہمیں، باؤ باشا جی..... پوش علاقے کس لیے ہیں..... اوپن..... کھلے ڈھلے، یاد رکھو، ٹاپ پہ جگہ ہمیشہ خالی ملے گی..... دیکھا نہیں تم نے، یہ لوگ آدھ فیصد بھی نہیں، اور پوری نسل کی کریم ہے یہ کریم۔ یہی قدر دان ہیں سمجھو جو بھی اس گاڑی میں سوار ہو گیا وہی شریف کہلایا۔ جنہیں ہم تم اشرافیہ کہتے ہیں دیکھو تو یہی سب لوگ باکمال ہیں، یہی حاکم یہی تاجر، یہی سرمایہ دار اور پھر یہی قسمت بدل دینے والے۔'' ایک لمحہ اس نے مجھے دیکھا اور بولا ''شاید تمہیں میری بات پلے نہیں پڑی؟''

''اور تم جو اپنے نام کے ساتھ سیٹھ اور سید لکھتے ہو، اس سے کیا نیک نامی ملتی ہے تمہیں؟''

''نیک نامی، بدنامی محض لفظ ہیں مرے باشا، ویسے میں اکیلا تو سید اور سیٹھ نہیں بنا، بے شمار لوگ میرے سامنے بنے ہیں..... جو بعد میں بنتا ہے وہی بعد میں لکھتا ہے اور سیٹھ تو میں ہوں سب اسی طور بنے ہیں۔ محنت سے ذہانت سے کوشش سے، اسی لیے سیٹھ شروع میں لکھتے ہیں، تم آج..... صرف آج کی رات میرے ساتھ چلو، آنکھیں کھول کر'' کدھر جانا ہے؟'' میں نے بے تکا سوال کر دیا تو اس نے کہا ''خوابوں کی دنیا کو دیکھنا چاہیے مرے باشا''

''تمہارے خواب اس قدر کالے ہوں گے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔'' میں منمنایا تو وہ مسکرا دیا..... میں نے کروٹ بدل لی اور مزید سوال و جواب سے بچنے کے لیے آنکھیں موند لیں۔

''سونا نہیں، سونا نہیں'' وہ چلایا، ''یاد رکھو جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔'' نورا فون پر فون کرتا جا رہا تھا اور مجھے حیرت ہو رہی تھی پھر وہ ٹہلنے لگا۔ دروازے تک جا جا کر واپس آ جاتا۔ اندر کی بے قراری اسے جینے نہ دے رہی تھی پھر وہ میرے سر پہ آ کر رک گیا اسے شاید کوئی نیا جواز سوجھا تھا اور واقعی یہ سچ تھا وہ ایک دو لمحے خاموش کھڑا رہا۔ اسے کبھی بات شروع کرنے میں دشواری نہ ہوئی تھی مگر آج اسے مشکل پیش آ رہی تھی..... خود کو تیار کرنے کے لیے اس نے سگرٹ سلگایا۔ اور تیسرے کش کا دھواں چھوڑتے ہوئے اس کی بھویں سکڑ گئیں..... چہرہ پتھریلا سا دکھائی دینے لگا۔ ایک مدبرانہ مسکراہٹ جو پتھریلے چہرے کو زیادہ بھیانک بنا رہی تھی ابھر آئی۔ وہ رازدارانہ انداز میں جھک کر مجھ سے بولا۔ ''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں استاد..... جو بندے کو پلے سے باندھ کر رکھنی چاہئیں۔ تم بھی یاد رکھنا.....'' اس نے خود کو پورے اعتماد سے یکجا کر لیا تھا۔ بولا ''عورت ایک ایسا بیرر چیک ہے مرے باشا جو ہر ملک کی کرنسی میں کیش ہو

سکتا ہے۔ یورو، پاؤنڈ، ڈالر، لیرا، ین، مارک، خصوصاً امارات کے دینار، درھم، ریال بھی۔ سنا تم نے..... یہ کرنسی ہے..... تو زندگی ہے..... زندگی ہے تو جینا ہے۔ اور جینا ہے تو پھر خوشیوں سے لد پھند کر جیو..... بھوک سے مرنا دنیا کی اذیت ناک موت ہے جو میں نے اپنے غیرت مند عزیزوں میں دیکھی تھی..... تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے..... آج بھی یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے سلگنے لگتے ہیں اور آدمی کا رب اس پر اتنا مہربان ضرور ہے کہ وہ اس کا رزق اتارتا ہے اس زمین پر، کسی میں گن ہی نہ ہو اس رزق تک رسائی کا تو رب کیا کرے.....''

میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میری زبان جیسے جکڑ لی گئی ہو۔ میں نورے سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شاید میں بہت کچھ کہہ دینے کے باوجود کچھ نہ کہنا چاہتا تھا..... میرے اندر دو رویے آمنے سامنے چل رہے تھے..... مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔ پتہ نہیں کب مجھ پر غنودگی اتر آئی۔ اور میں نیند میں ڈوب کر اس کرب سے دور ہوتا چلا گیا۔ دوسرے دن نورا..... بہت افسوس سے کہہ رہا تھا۔

''آٹھ دن میں ساڑھے آٹھ لاکھ بھی کچھ رقم ہے بھلا۔ وہ بھی دلی میں۔ تم کیا جانو مارکیٹ کتنی ڈاؤن جا رہی ہے..... ڈاؤن نہ ہوتی تو ایک کروڑ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر کیا کریں جب ہر تیسرا شخص یہی کاروبار کرے گا..... تو انڈسٹری تو زمین پر گرے گی نا سائی''

''کیسے ڈاؤن ہو سکتی ہے مارکیٹ'' میں نے اس کو طنز سے جھنجھوڑنا چاہا۔

''یہی تو ایک دھندہ رہ گیا ہے ہمارے آس پاس..... امارات میں، بھارت کی انڈسٹری میں..... کیٹ واکس اور فیشن شوز کے پردے میں..... تم کیسے مایوس ہوئے جا رہے ہو..... میں تم سے قرض مانگ رہا ہوں کیا؟''

وہ لمحہ بھر کو بھونچکا سا رہ گیا کچھ بول بھی نہ سکا۔ اُسے مجھ سے یہ توقع ہی نہ تھی۔ وہ تو مجھے ہمیشہ اللہ میاں کی گائے کہا کرتا تھا..... پیٹ کے اوپر نیچے کے دھندے کے بارے میں کھل کر بولتے دیکھ کر اسے حیرت تو ہونا ہی تھی..... مگر وہ ہار ماننے والا نہ تھا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے..... مگر اوپر کی مارکیٹ پر نظر نہیں ہے تمہاری.....''

''اوپر کی مارکیٹ؟''

''ہاں..... انڈر ورلڈ کا کالا دھن پہلے بمبے سے دبئی اور پھر دبئی شبئی سے بھی آگے نکلتا چلا گیا۔ کچھ سیٹھ لوگوں نے دبا لیا، ورنہ..... پیٹ سے اوپر کا دھندا کم ہوتا تھا نیچے کا زیادہ..... بلکہ بہت زیادہ۔''

''پھر بھی..... اتنا فرق تو نہیں پڑ جاتا دنوں میں؟''

''پڑ جاتا ہے.....'' وہ رکا رہا سوچتا رہا کہ مجھے کسی طرح قائل کرے پھر جھنجھلا کر بولا ''باؤ'' سبزی منڈی میں مال کے چار ٹرک ایک ساتھ آ جائیں..... تو ریٹ ڈاؤن ہو جاتا ہے..... بس یہی ادھر ہوا ہے۔ ملائیشیا سے کلکتہ تک کا مال'' بہت سستا..... ریٹ تو زمین پر آنا ہی تھا.....''

''مال زیادہ تو گاہک زیادہ..... کیوں؟'' میں اسے ستانا چاہتا تھا۔

''ارے کاکو.....'' اس کی ساری بصیرت اس کی آنکھوں میں آ کر جمع ہو گئی۔ مدبّر بن کر اس نے پتلیوں کو سکیڑا اور نگاہیں میری آنکھوں میں ڈبو کر کہا ''کاکے باؤ..... غور کر..... جب سے سونا مہنگا ہوا ہے نا..... ہر شخص بیچنے کو آوے ہے..... خریدنے کو کوئی نہیں آتا، پلے پڑا کہ نہیں؟''

''یہ تم سونا کہاں سے لے آئے ہو یہاں؟'' مجھے مزہ آ رہا تھا۔

''تم سمجھنا ہی نہیں چاہتے تو میں کیا کروں..... بس شاٹ بولتا ہوں میں فیصلہ کر چکا ہوں.....'' رک کر اس نے بات پوری کر دی ''کوئی دوسرا کاروبار کر لوں گا۔''

''توبہ کرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' میں نے کھٹاک سے کہا۔

''شرمندہ کرتے ہو کاکا باؤ.....'' وہ ذرا کی ذرا رکا اور پھر کہنے لگا۔

''بھائی میاں..... اب اس کام کے لیے شیش محل جتنا بنگلہ چاہیے، کروڑوں کا.....، روز کی روز نت نئی نوچیاں بدل بدل کے..... اور دلفریب رقصائیں جن پر فلم آرٹسٹ کا لیبل بھی ہو۔ جن کے میک اپ کا ماہانہ خرچا بھی لاکھوں کا ہوتا ہے..... نازنخرے اور ان کے لیے زبردست ایجنٹ بھی..... باتونی اور سوداگر..... قالین بیچنے والوں کی طرح کی چرب زبان..... یہ ہے آجکل کی انڈسٹری..... اور انڈسٹری اندھا سرمایہ چاہتی ہے..... چکا چوند، رنگین دنیا، اور سُروں کی بارش بھی۔ جو جس تیر سے گھائل ہو سکے، کر لیا جائے..... پھر ہن برستا ہے، یورو، پاؤنڈز، اور ڈالروں کی چھت ڈالی جا سکتی ہے منٹوں میں..... میں نے چار دن میں یہاں کی انڈسٹری چھان لی ہے..... ان کے پاس سب کچھ ہے..... نازنخرے بھی نوچیاں بھی، رقص بھی، سُر بھی، اور اربوں کھربوں میں ڈوبے سیٹھ بھی۔ ہماری دال گل گئی جتنی گلنی تھی۔ اب نکل چلو ٹھنڈے ٹھنڈے۔ کچھ نئی تیاری کروں جا کر شیش محل کے لیے۔ بنگلہ بنانا ہی پڑے گا۔ تم بھی اپنا سامان پیک کر لو۔ او کے۔؟ آج ہی روانگی ہے۔'' وہ مجھے ایک نئے تحیر میں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے جووز ٹینگ کارڈ گر گیا تھا میں نے سب سے پہلے اسے ہی اٹھا لیا۔

''سیٹھ نورالدین احمد سید، چیئرمین فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن، انٹرنیشنل فلمز'' اس کارڈ کے آخر میں دنیا کے بیشتر ممالک کے دفاتر کے پتے اور بہت سے فون نمبرز بھی تھے.....

محسوس ہوتا تھا..... یہ کارڈ آج ہی تیار ہو کر نورے کے پاس پہنچا ہے..... روانگی کا سن کر دل پر سے ایک بوجھ اترنے لگا تھا۔ میں نے جی بھر کر لمبا سانس لیا اور جلدی جلدی سامان پیک کرنے لگا۔

بیگم برلاس

بتریٰ رحمٰن

بیگم برلاس ان عورتوں میں سے تھی جسے مرد دیکھیں تو پگھلنے لگتے ہیں عورتیں دیکھیں تو کباب ہو جاتی ہیں۔ کباب ہونے والی تو بات تھی۔ تین بچے وہ بھی گیارہ، نو اور سات سال کے اس پر کمر کا یہ عالم جیسے اُردو شاعری کی معشوقہ ہو۔ شہابی رنگ، خوبصورت چمکدار آنکھیں چہرے پر وقت کی ایک شکن بھی نہ تھی۔ نہ مسکراتے وقت آنکھیں اور ٹھوڑی عمر کی چغلی کھاتیں۔

دُھلا دُھلا یا شفاف چہرہ، دلنوازی اور ملاحت الگ مناسب قد اور قیامت خیز جسم، بس دو اُبھار آگے اور دو پیچھے، باقی کہیں فالتو گوشت اور چربی کا قبضہ نہ تھا اور اس پر جیسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی 'خدا نے خاص طور پر ودیعت کیا تھا۔ بات کرنے کا انداز تو جیسے اس نے کسی مکتب سے سیکھا تھا۔

اتنے شائستہ لب و لہجے میں بات کرتی کہ محفل کا دل موہ لیتی۔ عجیب بات ہے پہلی ملاقات میں ہی عورتیں اس پر عاشق ہو جاتیں اور عاشق ہوئے بنا نہ رہتیں اُس کی ہر ادا میں شیرینی گھلی ہوئی لگتی اور پھر جب محسوس کرتیں کہ ان کے شوہر بھی اس شیرینی کے گھائل ہوا چاہتے ہیں تو ناک پر کپڑا رکھ کر اتنی دور ہو جاتیں جیسے انہیں بیگم برلاس کے کُندن کُندن جسم سے 'بو آ رہی ہو۔

بیگم برلاس اس کالونی میں نئی نئی آئی تھیں ان کے شوہر گریڈ ۲۲ کے سرکاری ملازم تھے اور یہ کالونی ایسے ہی سرکاری ملازمین کے لیے تمام تر جدید سہولتوں کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ نئے لوگ آتے رہتے اور پرانوں کی ٹرانسفر ہوتی رہتی۔ اس چھوٹے سے شہر میں دلچسپی کی اور کوئی بات نہ تھی نہ فوجیوں کی طرح باقاعدہ سوشل لائف تھی، نہ طرح طرح کے اسکینڈل اِدھر اُدھر سے اڑ کر آتے تھے اس لیے کالونی کی عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط رکھتی تھیں۔ دوستیاں بھی چلتی تھیں اور در پردہ دشمنیاں بھی چلتی تھیں..... پارٹیاں بھی ہوتیں اور ایک دوسرے کی جاسوسیاں بھی۔ ماتحتوں کی بیویاں افسروں کی بیویوں سے نالاں بھی رہتی تھیں اور خوشامدیں بھی کرتی تھیں۔ افسروں کی بیویاں سب سے ملتی 'جلتی بھی تھیں اور اپنے اسٹیٹس کی ٹانگ اُوپر بھی رکھتی تھیں۔

بیگم برلاس آئی تو جیسے کالونی انگڑائی لے کر جوان ہو گئی۔ بیگم برلاس ایک خبر تھی، واقعہ تھی، عجوبہ تھی۔ پہلے پہل عورتیں مائل ہوئیں۔ بعد میں انگشت نمائی کی۔ پھر مرد انگشت بدنداں ہوئے۔ اسمارٹ عورتیں یہاں پہلے بھی تھیں مگر ان کے چراغ خود بخود 'بجھ گئے تھے۔ اپنے روایتی سے فلیٹ کو بھی بیگم برلاس نے اپنے فنکارانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ بڑی عمدگی سے سجایا تھا۔ لاؤنج میں بچوں کے لیے ایک خوبصورت لائبریری بنا دی تھی۔ اپنے ہاتھ سے پینٹ کر کے سبزیاں لٹکائی تھیں اور بچوں کی دلچسپی کا ہر سامان وہاں رکھا تھا۔ تبھی ہر گھر کے بچے وہاں جا کر کھیلنا پسند کرتے۔

ہاں بیگم برلاس کے شوہر یعنی برلاس صاحب بالکل عام شوہروں کی طرح تھے۔ چالیس پینتالیس کے درمیان تھے۔ سر کے بال وفات پا چکے تھے۔ صرف کناروں پر ایک جھالر سی رہ گئی تھی جو انہیں عمر رسیدہ بنائے رکھتی۔ اُونچے لمبے تھے، سمارٹ تھے مگر اپنی بیگم کے سامنے بجھے بجھے سے لگتے تھے اور ہمیشہ نظریں جھکائے رکھتے جیسے ان سے کوئی جرم سرزد ہو چکا ہو اور ہر دم تلافی میں لگے رہتے ہیں۔ ہاتھوں کو مسلتے رہتے اور مسکراتے رہتے۔ بڑی دھیمی آواز میں باتیں کرتے اور بلقیس برلاس کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا پیدائشی فرض سمجھتے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر محفل میں باتوں کے پھول پھینکتی جاتی اور برلاس صاحب جُھک جُھک کر وہ پھول یوں 'چنتے جاتے جیسے یہی ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔

''یہ چھنالیں ہوتی ہیں۔'' عورتیں جل کر کہتیں۔

''ان کو گُر آتے ہیں شوہروں کو اُلو بنانے کے۔''

''نہیں ان کے پاس تعویز ہوتے ہیں۔''

''نہیں بابا، ان کے پاس کوئی سینہ بہ سینہ چلتا ہوا ٹوٹکا ہوتا ہے اور پہلی رات ہی یہ وہ ٹوٹکا آزما لیتی ہیں۔ تبھی شوہر زن مرید ہو جاتے ہیں۔''

''ہائے پہلی رات ہی.....؟''

''ہاں ہاں.....''

''ہائے پہلی رات کسے ہوش ہوتا ہے۔''

''میں بتاؤں، میری ایک تائی نے مجھے بھی بتایا

تھا....."

"کیا.....کیا.....؟"

"اللہ توبہ کیسے بتاؤں؟ میں تو اپنی زبان سے بتا ہی نہیں سکتی۔"

"پھر تو نے کیا؟"

"لو اور سنو، ڈر کے مارے میں تھر تھر کانپ رہی تھی جب سب کچھ ہو گیا تب مجھے ہوش آیا۔"

"اری دوسری رات آزما لیتی.....؟"

"بھئی..... وہ پہلی رات کے لیے ہی تھا۔"

کھل کھل کھل.....سب ہنس پڑتیں۔

سو خواتین کا خیال تھا کہ بیگم برلاس کے پاس ایسا ہی کوئی ٹوٹکا ہے جس سے نہ صرف اس نے اپنے شوہر کو اسیر کر رکھا ہے۔ بلکہ یہ شعاعیں دوسرے مردوں پر بھی پھینکتی رہتی ہے۔ اسی لیے تو سارے مرد اس کو بنظرِ تحسین دیکھتے تھے۔

"واہ کیسی شاندار چائے پلاتی ہے۔" "واہ کتنے اسٹائیلش کپڑے پہنتی ہے۔" "واہ کیا مارولس فگر پایا ہے۔" "رکھ رکھاؤ میں کتنی شائستگی ہے۔" "بچوں کو کتنا اچھا رکھتی ہے۔"

کالونی کا ہر افسر برلاس صاحب کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھنا چاہتا تھا اور یہ خواہش کرتا تھا کہ ہفتے میں ایک بار ان کے ہاں سوشل کال کے لیے جائے۔ بیگم برلاس ہمیشہ اپنی اسی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ملتی۔ ہمیشہ خوبصورت کپڑوں میں ہوتی۔ بڑی اچھی تواضع کرتی اور ہر بار کوئی نئی چیز بنا کر چائے کے ساتھ پیش کرتی۔ گو یہ سب کچھ اپنی تنخواہ اور حیثیت کے دائرے میں رہ کر ہی کرتی۔ مگر اس میں بھی وہ نیرنگی اور تنوع پیدا کر لیتی۔ اس نے مہمانوں کو سامنے بٹھا کر کبھی مہنگائی کا رونا نہیں رویا تھا۔ اس کا ایمان تھا ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔

اسے کپڑوں اور فلموں کے علاوہ بھی بہت سے موضوع یاد تھے جن پر بے تکان بول لیتی۔ مردوں کے معاشی اور دفتری مسائل سے آگاہ رہتی تھی۔ اچھے اچھے سوالوں میں نہ صرف ان کا مسئلہ پوچھ لیتی بلکہ حل بھی بتا دیتی۔ کوئی بھی سمجھدار عورت زیادہ دن تک اپنے شوہر کے منہ سے دوسری عورت کے لیے عش عش نہیں سن سکتی جب مردوں کی زبانیں بند کرنے کی کوشش کی گئی تو ان کی آنکھیں بولنے لگیں۔ بولتی آنکھوں پر کون پہرے بٹھا سکا ہے اس لیے بڑی شدو مد کے ساتھ بیگم برلاس کے عیبوں کی ڈھنڈیا بجی۔ بے عیب تو صرف اللہ کی ذات ہے۔

"ہوگا اس میں بھی کوئی نہ کوئی کھوٹ۔" چنانچہ خواتین بے قرار رہتیں اس ٹوہ میں لگی رہتیں۔ کوئی تو بات ملے۔ کوئی تو نقص پکڑیں۔ بالآخر ان کو ایک بات مل ہی گئی اور کیسی اچھی بات ملی۔ جس کو وہ برملا کہتیں اور ہر ملاقات میں چٹخارے لے لے کر دہراتیں اور پھر اپنے شوہروں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ کر خوب قہقہے لگایا کرتیں۔ "بیگم برلاس کے ہاں خانساماں نہیں ٹکتا۔"

"ٹکے بھی کیسے؟ ایسی نخری عورت کے پاس کون ٹک سکتا ہے؟"

"یہ تو بیچارہ شوہر ہے جو اس کے پاس ٹکا ہوا ہے۔ اس کے اختیار میں ہو تو وہ بھی بھاگ جائے۔"

بیگم برلاس کی آمد کے بعد جو خبر زیادہ اُچھالی گئی وہ یہی خانسامے کی خبر تھی۔ آئے دن وہ اپنا خانساماں نکال دیتی ہے۔ کچھ خواتین کا خیال تھا خانساماں خود بھاگ جاتا ہے۔ "سنا ہے آپ کا خانساماں پھر چلا گیا۔"

"ہاں....." وہ بڑے سکون سے کہتی۔ "بڑے نخرے ہو گئے ہیں ان لوگوں کے۔"

"ہاں ہو تو گئے ہیں!" وہ اسی انداز میں جواب دیتی۔

"کیوں چلا گیا آخر.....؟ جب اتنی زیادہ تنخواہ مل رہی تھی۔"

"وہ تو شاید نہ جاتا، مجھے ہی نکالنا پڑا۔"

"سچی! بھلا بات کیا ہوئی؟"

بہت گندہ اور غلیظ تھا۔ گاؤں سے آیا تھا۔ میں نے سوچا رفتہ رفتہ سدھر جائے گا۔ نئے کپڑے بنا کر دیے اور سمجھایا کہ ہر روز نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر باورچی خانے میں آیا کرو۔ ایک مہینہ تو صاف ستھرا رہا۔ پھر بولا مجھ سے روز روز کپڑے نہیں دھوئے جاتے۔ کم بخت اتنا گندا رہتا کہ بُو کے مارے میں کچن میں کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ برتن بھی صاف نہیں دھوتا تھا اور کام کرنے کے دوران بار بار ناک صاف کرتا تھا۔ میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی تھی۔ بس بہن مجھے گندگی اور غلاظت ہرگز پسند نہیں۔ میں کہتی ہوں بے شک آدمی بھوکا رہ جائے مگر غلیظ خانسامے کے ہاتھ کا پکا ہوا نہ کھائے بہت دن تک برداشت کرتی رہی بالآخر نکالنا پڑا۔"

کچھ دن تک یہ کہانی کالونی میں گشت کرتی رہی۔ پھر بیگم برلاس نے ایک جوان سی لڑکی رکھ لی جو ساتھ کے گاؤں سے آئی تھی غریب تھی۔ بچوں کا بہت

دھیان رہتی سی۔ اس کے کام سے بیگم برلاس بہت خوش تھی۔ صرف کھانا اُسے خود پکانا پڑتا۔ باقی گھر کا سارا کام صغرا کر دیتی تھی۔ انہی دنوں اُس کی ایک سہیلی نے اُسے ایک خانساماں بھیج دیا اور مارے ضرورت کے اُسے بھی رکھنا پڑ گیا۔ بڑا صاف ستھرا اور اسمارٹ خانساماں تھا چھ جماعتیں پڑھا ہوا تھا، کشمیری تھا۔ کسی ریسٹ ہاؤس میں کام کر چکا تھا۔ ''سر جی سر جی'' کہہ کر مخاطب کرتا اور بات بات پر سر جھکاتا۔

بیگم برلاس کو پسند آ گیا۔ تب صغرا رونے لگی کہ اب اس کو نکالا جائے گا مگر بیگم برلاس نے اس کو نکالا نہیں۔ بچی کے لیے رکھ لیا اور صفائی ستھرائی کا کام اس کے ذمے لگا دیا۔ دو چار مہینوں کے پھر افواہ اڑی کہ بیگم برلاس کا خانساماں بھاگ گیا۔ خواتین نے شام کو پھر ایک دوسرے کے گھر جانا شروع کر دیا۔ جب اچھی طرح ٹوہ نہ لگی تو پھر بیگم برلاس کے گھر کا رُخ کیا۔

''ہائے کتنا افسوس ہے۔ آپ کا خانساماں پھر چلا گیا۔'' ''نہیں مجھے تو کوئی خاص افسوس نہیں۔''

''وہ لڑکی ہوگی آپ کے پاس۔'' ''میں نے اُسے بھی نکال دیا۔''

''ہائے اُسے کیوں نکالا۔''

''نکالنا ہی پڑا، میری امی ٹھیک کہا کرتی تھیں کہ گھر میں جوان لڑکی کو نہیں رکھنا چاہیے۔''

''ہائے کیا ہوا؟'' ''کیا ہوا؟'' ''کیا کیا اس کم بخت نے۔''

''وہی جو ہو سکتا ہے۔'' ''یعنی..... یعنی'' ''اس خانسامے کے ساتھ''

''ہاں کافی دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ صغرا اور یونس میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ وہ سارا سارا دن باورچی خانے میں کھڑی ہنستی اور مٹکتی رہتی اور یونس بھی ماتھے پر بال ڈالے ہیرو بنا مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا رہتا طریقے طریقے سے میں اسے سمجھاتی رہتی اس پر کڑی نظر رکھتی، زیادہ باورچی خانے میں نہ بھیجتی۔ مگر سوچا، کوئی بات نہیں جوان لڑکی ہے۔ ہنسی مذاق سے آگے نہ جائے گی پھر ایک دن آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا۔''

''کیا دیکھ لیا؟'' ایک خاتون بے چین ہو اُٹھی۔

''بہن یہ، باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں، بس جس حالت میں بھی دیکھا پھر انہیں رکھنے کو دل نہیں چاہا۔''

''دونوں کو جوتے لگانے تھے۔'' ''اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔''

''جب ان کو شرم نہیں تھی تو یہ کیا کہتیں۔'' دوسری بولی ''ہاں بہن! ان غریب لوگوں کا اخلاق تو بالکل ہی بگڑ گیا ہے۔ ذرا شرم اور مروّت نہیں رہی۔''

''میں نے تو.....'' بیگم برلاس نے جواب دیا ''صغرا کی ماں کو بلا کر سب کہہ دیا تھا۔ اب آگے اس کی مرضی'' ''پھر کیا ہوا بہن؟'' ایک اور بولی ''تمہارے گھر کا کام چل رہا تھا۔ اتنا آرام دے رکھا تھا۔ انہوں نے گناہ کرنے تھے تو، اپنے سر پر، تم کام چلائے جاتیں۔''

نفرت کی ایک شکن بیگم برلاس کے ماتھے پر اُبھری۔ ''بس میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے۔ ایک آدمی جو صبح و شام برا کام کرتا ہو۔ کم از کم میں اس کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھا سکتی۔ میں تو اس سے کچھ بھی نہیں کروا سکتی۔ حتیٰ کہ گھر میں بھی نہیں رکھ سکتی۔ اس کا پہنچایا ہوا آرام ذہنی کوفت کا باعث بن جاتا ہے۔''

''دیکھا کتنی نخریلی ہے یہ عورت۔'' پھر نئے خانسامے کا قصہ گڈی بنا ہر گھر پر اُڑا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد کہیں سے ایک بنگالی آ گیا۔ سب نے یک زبان کہا ''بنگالی خاسامے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ نوکری چھوڑ کر جاتے نہیں اور اب جائیں گے بھی کہاں؟ اب تو یہیں کے ہو گئے۔''

بنگالی خانساماں واقعی بہت اچھا تھا۔ پہلا ہفتہ اس نے بہت اچھا کام کیا۔ بیگم برلاس نے اس کے سارے حالات پوچھ لیے تھے۔ وہ اتنے عرصے سے یہاں آیا ہوا تھا کہ اس کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے نام بھی بھول گئے تھے اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ بیگم برلاس نے سوچا اس کا آگا پیچھا کوئی نہیں۔ محبت سے رکھا تو نک جائے گا۔ نئے کپڑے لا کر دیے۔ باورچی خانے میں پنکھا لگا دیا۔ ایک بری عادت تھی اُسے، سارے وقت سگریٹ پیتا۔ ایک سیکنڈ کے لیے منہ سے سگریٹ نہ جدا کرتا اور بیگم برلاس کو سگریٹ سے بڑی نفرت تھی۔ شادی کے پہلے سال اُس نے برلاس صاحب کے سگریٹ چھڑوا دیے تھے۔

مگر دوسری عادت سگریٹ سے کہیں توجہ طلب تھی، آتے ہی اُس نے کچھ رقم ایڈوانس مانگی اور ایک دن کی چھٹی بھی۔ بیگم برلاس نے بخوشی دے دی۔ پھر تو اس کا معمول ہو گیا۔ ہر ہفتے ایک مکمل چھٹی مانگتا یعنی پورا دن اور پوری رات اور پچاس روپے ایڈوانس بھی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ اسے فلم دیکھنے کی بہت عادت ہے۔ وہ فلم دیکھے اور سگریٹ پیے بغیر ہرگز زندہ نہیں رہ سکتا۔

''مگر تم اپنے سارے پیسے سگریٹ اور فلم پر ہی خرچ کردو گے تو پھر کیا بچاؤ گے۔''

''جی میرا اس دنیا میں کوئی نہیں، کس کے لیے جمع کروں؟'' کماتا ہوں اُڑتا دیتا ہوں۔ اسی میں میری کھسی ہے۔''

ایک مہینہ تو گزر گیا۔ پھر بیگم برلاس کو اس کی اصلاح کی سوجھی بولی۔ ایک ہفتے میں صرف دس روپے ملیں گے اور پندرہ دن بعد ایک چھٹی۔''

جس ہفتے اُسے چھٹی نہیں ملی۔ بنگال کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔ ایسے لگتا تھا۔ آج کسی کا سر پھاڑ دے گا۔ نہ اس نے کھانا پکایا نہ باورچی خانے میں آیا۔ سارا دن بال بکھرائے گھر کے آس پاس گھومتا رہا اور اونچے اونچے بولتا رہا۔ ہر آدمی سے اُلجھتا رہا۔ آخر تنگ آ کر بیگم برلاس نے اُسے چھٹی دے دی اور بولی ''پیسے صرف دس روپے ہی ملیں گے۔ ان میں فلم دیکھی جاسکتی ہے۔''

وہ بولا ''نہیں میں تو پچاس روپے ہی لوں گا۔''

''پچاس نہیں مل سکتے۔''

''مگر میرا کام پچاس روپے میں ہوتا ہے۔''

''کون سا کام؟''

''بس جی ہے۔'' اُس نے گردن جھکالی۔

بیگم برلاس نے کچھ سوچتے ہوئے اُسے پیسے تھما دیے۔ رات کو جب وہ واپس آیا تو بالکل بدلا ہوا آدمی لگ رہا تھا۔ بات بات میں دانت پھاڑ کر ہنستا۔ بچوں کے ساتھ مزے مزے کے کھیل کھیلنے لگا۔ بھاگ بھاگ کے سب کام کرنے لگا۔ ایسے جیسے کسی نے اس کی کینچلی بدل دی ہو۔ پھر نیا ہفتہ آیا وہی ڈراما پھر شروع ہوگیا۔ پھر وہی چیزیں پٹخنے لگا پھر اودھم مچانے لگا۔

بیگم برلاس کو یک بیک اس سے گھن آنے لگی۔ اس کا سارا حساب کر کے اس کو رُخصت کر دیا۔ یہ ہفتہ وار جھنجٹ نکالنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے بعد جو خانساماں آیا وہ شکل سے بڑا یتیم لگتا تھا دھیمے دھیمے کام کرتا رہتا۔ مگر ایک دن جب کہ بیگم برلاس اندر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی سن رہی تھی۔ وہ کالونی کے سب ملازمین کو اکٹھا کر کے اپنی بہادری کے قصے سنا رہا تھا۔

''ہاں تھی وہ بڑی اکڑفوں..... اور سارے گاؤں نے اس پر شرطیں لگائی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا یہ کون سا مشکل کام ہے۔ مرد میں ہمت ہونی چاہیے..... بس جی..... بس جی ایک دن میں تاک میں رہا۔ وہ بازار سے گزر رہی تھی۔ میں نے پکڑ کر لٹا دیا۔''

''وہیں..... سڑک پر؟'' ''ہاں ہاں'' ''سب لوگوں کے سامنے؟''

''ہاں سب لوگوں کے سامنے۔'' ''واہ مرانگی ہوئی نا۔''

''بس پھر کیا ہونا تھا؟ حرام مزادی نے مجھ پر مقدمہ کر دیا۔ پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ تب سے گاؤں سے نکلا ہوا ہوں۔ اب واپس نہیں جاسکتا۔ پکڑا جاؤں گا۔'' بیگم برلاس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگلے مہینے چپ چاپ تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھی اور جانے کا حکم سنا دیا۔ وہ حیرت سے بیگم برلاس کا منہ دیکھتا ہوا رُخصت ہوگیا۔

پھر اُس نے ایک لڑکا رکھ لیا۔ پندرہ سولہ برس کا ہوگا۔ سوچا اس کو کام سکھائے گی۔ مگر وہ بھی کم بخت تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوارٹر میں بھاگ جاتا اور جب واپس آتا تو پسینے میں تربتر ہوتا دو ننھے منھے بیٹے اور ایک بیٹی اُس کے آس پاس کھیلتے تھے۔ بیگم برلاس نے پندرہ دن بعد ہی اُسے رُخصت کر دیا۔

کتنی بار بیگم برلاس اپنے شوہر سے کہہ چکی تھی کہ وہ دیکھ بھال کر کوئی اچھا سا خانساماں رکھ دیں یا کسی سے کہہ کر منگوا دیں۔ مگر وہ اس معاملے میں بالکل دخل نہ دیتے تھے۔ اخبار لے کر ایک طرف بیٹھ جاتے اور کہتے ''بھئی یہ تمہارا گھریلو معاملہ ہے جسے چاہو رکھو، جسے چاہو نکالو۔''

کبھی یہ بھی نہ پوچھا کہ اتنے خانسامے آ کر کیوں چلے گئے۔ جب کہ کالونی کی سب عورتیں بار بار آ کر یہی سوال پوچھتی تھیں۔ جب بیگم برلاس تہیہ کر لیتی کہ اب وہ خانساماں بالکل نہیں رکھے گی تو پھر کوئی سہیلی یا واقف کار کوئی خانساماں بھیج دیتا اور اُسے رکھنا پڑتا۔ اس کی فطری پاکیزگی اور نفاست طبع کسی بے ہودگی کو قبول نہ کرتی تھی۔ جبکہ باقی خواتین گندے، غلیظ، بدتمیز قسم کے خانساموں کے ساتھ بڑی اچھی طرح گزارہ کر رہی تھیں۔ اب ملاقاتوں میں کچھ اس طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔

''اے سنا تم نے بیگم برلاس کا خانساماں پھر بھاگ گیا۔''

''اچھا'' ''ہاں'' ''اُس کے بارے میں کیا کہتی ہے وہ۔''

''کہتی ہے کم بخت شرطیں بہت لگاتا تھا۔ کبھی کہتا تھا ساری دیگچیاں بدلیں میں اسٹیل کے برتنوں میں نہیں پکا سکتا۔ کبھی کہتا تھا بچے بار بار فرمائشیں نہ کیا کریں اور ایک دن کہنے لگا آپ بہت ٹوکتی ہیں۔ اگر باورچی خانے میں آئیں گی تو میں کام نہیں کروں گا۔''

''اچھا..... اچھا..... پھر بیگم برلاس نے کیا کیا۔''

وہ بولی ''میں نے کہا آج یہ مجھے باورچی خانے میں آنے سے روکتا ہے۔ کل کہے گا شوہر کے کمرے میں مت جاؤ۔ بس نکال دیا۔'' پھر سب قہقہے لگاتیں۔

''ہاں تو اب کیا کہتی ہے بیگم برلاس'' اگلی مرتبہ کوئی اور مطلع اُٹھاتی۔

''کہتی ہے یہ آدمی کسی کی بیوی کو بھگا لایا تھا۔''

''ہوں تو اس مرتبہ کیا عذر پیش کیا اُس نے؟''

''کہتی ہے یہ خانساماں ہر تیسرے دن بیوی کے پاس جانے کی چھٹی مانگتا تھا۔''

''تو کیا بیوی کے پاس جانا جرم ہے؟''

''خود تو اپنے خاوند کو گھٹنے سے لگائے بیٹھی رہتی ہے!'' ''ویسے ہے عجیب عورت''

''واقعی برلاس صاحب کو اِدھر اُدھر کہیں بھی گھومتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ دفتر سے آ کر ہمیشہ بیوی کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ اگر کہیں جائے گا بھی تو بیوی کے ساتھ۔''

''میں نے ایسا زن مرید آدمی اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ ورنہ گھر کے معاملات میں ضرور دخل دیتا اور نہیں تو خانسامے کے معاملے میں ہی بیوی پر سختی کرتا۔ اب میرے میاں کو ہی دیکھو کبھی نوکر کے ساتھ اُونچی آواز میں بات نہیں کرنے دیتے۔ کہتے ہیں اب پہلا زمانہ نہ سمجھو۔ اب یہ لوگ بہت سر چڑھ گئے ہیں چلا گیا تو کیا کرو گی؟ بھئی میرے پاس تو پچھلے تین سال سے ایک ہی خانساماں ہے۔ میں نے کبھی دخل اندازی نہیں کی۔ وہ کہاں سے آتا ہے؟ کہاں جاتا ہے۔ تنخواہ کا کیا کرتا ہے ہمارا کام اچھا کر رہا ہے بس ٹھیک ہے۔'' ''بس جی بیڈ کیریکٹرز تو بیگم برلاس کے پاس آتے ہیں۔''

''ایسے ہی اسے خود بھی ڈراما کرنے کی عادت ہے ذرا یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ باقی عورتوں سے مختلف ہے کوئی اونچی چیز ہے۔''

''مگر نوکر رکھنے کا سلیقہ خود نہیں آتا۔''

اب بیگم برلاس کے بارے میں کچھ اس طرح مشہور ہو گیا تھا۔ ''وہی بیگم برلاس جس کے پاس خانساماں نہیں ٹکتا۔''

دو سال میں اس نے کوئی آٹھ دس خانسامے بدلے تھے۔ حسب معمول کچھ عرصہ یونہی گزر گیا۔ پھر کسی نے ایک لڑکا بھیج دیا۔ سو بار قسم کھانے کے باوجود اسے خانساماں رکھنا پڑتا تھا کہ اس کے بغیر گزارا نہیں ہوتا تھا۔ کریم بخش ایک دیہاتی لڑکا تھا۔ صحت مند اور چُست، چاق و چوبند تھا۔ مگر اتنا ہی بے وقوف بھی تھا۔ بہرحال آدمی کام اچھا کرتا ہو تو اُس کی بے وقوفی برداشت کر لی جاتی ہے اور پھر کام کروانے والا بے وقوف ہو تو بے وقوفی فائدہ مند بن جاتی ہے۔ خانسامے کی ضرورت اس لیے بھی پڑ رہی تھی کہ بچوں کے امتحان ہو رہے تھے اور ہر سال امتحانوں کے بعد ایک مہینے کے لیے بیگم برلاس بچوں سمیت میکے جاتی تھی۔ میکہ کراچی میں تھا اور اتنے عزیز تھے کہ بعض اوقات ایک مہینہ بھی ناکافی ہوتا۔

ادھر برلاس صاحب اتنے شرمیلے اور گھریلو قسم کے آدمی تھے کہ ان کا مسئلہ حل کیے بنا وہ گھر سے نہ نکل سکتی تھی۔ نہ وہ کسی کے گھر سے کھانا کھاتے نہ ہوٹلوں کے شوقین تھے۔ نہ انہیں وقت بے وقت گھر آنا پسند تھا۔ بس جس طرح کی اُن کی زندگی تھی وہ اسی طرح رہنا چاہتے۔ سو کریم بخش کو اُس نے غنیمت جانا اور پندرہ دن میں اس کو برلاس صاحب کی عادتوں اور کھانے پینے کے متعلق سمجھا دیا۔ گھر کے بارے میں بھی ضروری ہدایات دیں۔

اتنے دنوں میں ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکا ایماندار اور محنتی ہے ہیرا پھیری نہیں کرتا۔ البتہ منہ پھٹ اور بڑبولا ضرور تھا۔ جیسا کہ اکثر بے وقوف لوگ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو بیگم برلاس کے منہ پر اُسے جھوٹا کر دیتا یا ٹوک دیتا لیکن اس وقت چونکہ وہ ضرورت مند تھی۔ ان باتوں کا بالکل خیال نہ کرتی۔ اس کا خیال تھا واپس آ کر اس کی ٹریننگ کرے گی۔ اس نے ایک مہینے کا سارا سودا سلف اور ضرورت کی چیزیں لا کر رکھ دیں۔ حتیٰ کہ کھانے کا مینو بنا کر بھی کریم بخش کو دے دیا..... اور سمجھا دیا کہ صاحب بازار کا کھانا بالکل نہیں کھاتے۔ انہیں وقت پر کھانے کی عادت ہے اس لیے وہ زیادہ تر گھر پر رہے۔ آوارگی میں وقت ضائع نہ کرے۔ میں کوئی بیوقوف ہوں جی مجھے پتا ہے تسی سارا گھر میرے پر چھوڑے جا رہے ہو۔ بے فکر رہو جی، بالکل نگاہ میں رکھوں گا..... ہاں جی'' پھر دانت پھاڑ کر ہنسا ''اور صاحب کا بڑا خیال رکھوں گا جی۔ وہ آپ کو ''پھراموس'' کر دیں گے..... ہاں جی!''

''احمق'' بیگم برلاس کو ہنسی آ گئی۔ ''اور میرے آنے تک کہیں جانا نہیں۔ سنا اگر جانا بھی ہوگا میرا انتظار کر لینا۔''

''توبہ جی..... او جی میں نہیں بھاگوں گا۔ میں تو جی کام کرنے نکلا ہوں جہاں بھی جاؤں گا کام ہی کرنا ہے۔ جب تک آپ زبردستی دھکے دے کر نہیں نکالیں

گی میں نہیں جاؤں گا۔ دردر..... رلنے کی عادت نہیں ہے جی..... ہاں جی..... جب آپ کی نیت بدل جائے۔ مجھے بتا دینا جی..... ویسے صاحب بھی بڑے بھلے ہیں جی.....؟''

''بکواسی.....'' بیگم برلاس نے سوچا کچھ زیادہ کہنا بیکار ہوگا۔ کم از کم اب وہ تسلی سے میکے جا سکتی ہے۔ ایک مہینے بعد بیگم برلاس واپس آئی تو گھر کی حالت ابتر تھی۔ نہ صرف یہ کہ چہار طرف بے شمار گندگی تھی۔ بلکہ چینی کے بہت سے برتن ٹوٹے ہوئے تھے۔ کٹلری میں سے کئی چیزیں غائب تھیں۔ ٹی کوزیاں میل چکٹ ہو رہی تھیں۔ باورچی خانے میں جگہ جگہ چکناہٹ اور کالک کے دھبے تھے۔ گھر نہیں اچھا خاصا کباڑ خانہ لگتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ عورت کی عدم موجودگی میں گھر کی حالت ابتر ہو جاتی ہے مگر اس قدر بھی نہیں جس شے کو ہاتھ لگاؤ اسی میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ.....!

بیگم برلاس کو سارا قصور اسی کریم بخش کا نظر آیا۔ بس اس نے بات بے بات کریم بخش کو جھڑکنا شروع کر دیا۔

''یہ کس نے کیا ہے؟'' ''مجھے کیا پتا؟'' ''وہ کس نے کیا ہے؟'' ''مجھے کیا پتا؟''

ہر بات کا جواب وہ ڈھٹائی سے دیتا۔ نہ صرف یہ بلکہ دانت پھاڑے ہنستا رہتا اور سگریٹ کے سوٹوں پر سوٹے لگائے جاتا۔ حالانکہ جب وہ آیا تھا سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ شاید پیتا ہو مگر بیگم برلاس کے سامنے کبھی نہیں پیتا تھا اور اب ایسے پیتا تھا جیسے پرانا عادی ہو۔ ان لوگوں کو شہر کی ہوا کتنی جلدی لگ جاتی ہے۔ سڑک پر کھڑا راہگیروں سے باتیں کرتا رہتا۔ اس کے ہنسی ٹھٹھے کی آوازیں اندر بھی آتیں۔ ہر روز کسی نہ کسی بات پر اسے ڈانٹ پڑ جاتی۔

''کریم بخش! خبردار جو تو نے ہانڈی پکاتے ہوئے سگریٹ پیا۔ اب اگر میں نے باورچی خانے میں تجھے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ لیا تو تیرے ہاتھ پر چمٹے ماروں گی۔ کم بخت! اتنی تنخواہ نہیں جتنے سگریٹ پی جاتے ہیں۔ اتنے سگریٹ تو صاحب حیثیت لوگ نہیں پیتے؟''

اب ایسا ہوتا کہ ہانڈی پکاتے پکاتے وہ باہر بھاگ جاتا اور برآمدے میں کھڑا ہوا کر سوٹا لگاتا۔ جب بیگم برلاس کی آواز سنتا تو سگریٹ بجھا کر اندر بھاگ آتا۔ گو بیگم برلاس کو بُو سے پتا چل جاتا تھا۔ مگر وہ خاموش رہتی۔ ''ذلیل، حرام زادہ''

کسی نہ کسی موقعے پر وہ غصہ نکال لیتی اور اس دن تو اس کا غصہ ہر مصلحت کو نگل گیا جس دن منگو جمعدارنی نے آ کر شکایت کی۔

''جی! کریم بخش ہر روز مجھے چھیڑتا ہے۔ بیگم صاحب جی آپ کے پیچھے بھی جی بہت واہیاتیاں کرتا تھا جی..... میں تو ڈر کے مارے اکیلی کام کرنے نہیں آتی تھی جی..... پر آج تو جی اُس نے سڑک پر میرا دوپٹہ کھینچ لیا۔''

''دیکھا..... پیٹ بھر کر کھانا ملے تو ان کا نفس بے قابو ہو جاتا ہے۔ نیچ کہیں کے۔'' بیگم برلاس نے دل میں سوچا۔

''اچھا تم جاؤ اپنا کام کرو۔ میں اس کو ٹھیک کر لوں گی۔''

جاتی ہوئی جمعدارنی کو بیگم برلاس نے نظر بھر کر دیکھا۔ کیسی کسی کسائی تھی کم بخت۔ اتنے چنے پھنسائے کپڑے پہن کر چلتی تھی کہ خواہ مخواہ چھیڑنے کو دل چاہے۔ پر آج کل جو اس کا روپ تھا۔ پہلے ایسا نہ تھا شاید خاوند نے اس سے صلح کر لی ہو اُس نے دل میں سوچا۔ جمعدارنی نے اس طرح شکایت کی تھی جیسے نخرہ کیا ہو۔ شکایت میں بُرا ماننے والے عنصر کم اور خودنمائی کے عنصر زیادہ تھے۔

''یہ کمین لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔'' اتفاق سے کریم بخش صبح کا سودا لینے گیا۔ دوپہر بارہ بجے آیا۔ اس بات نے بیگم برلاس کے غصے کو اور ہوا دی۔ بس اُس کے آتے ہی برس پڑی۔

''جی گوشت کی دکان پر رش بہت تھا۔'' ''تم کسی اور دکان پر چلے جاتے۔''

''ہاں! واقف دُکاندار کو چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلا جاتا۔ پھر آپ کہتیں کہ یہ کتے کا گوشت کہاں سے لائے ہو۔''

''الو کے پٹھے بکواس بند کرو۔'' بیگم برلاس گرجی۔

''تمہیں بھی چار دن میں پر لگ گئے ہیں۔ یاد رکھو میں تمہاری طبیعت درست کر دوں گی۔''

''اس نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ خانساماں نکال دیتی ہے مگر اس مرتبہ سختی کر کے اسی کو درست کرے گی۔

''جی، میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ گستاخی سے بولا۔

''تیرے کرتوت تو ساری کالونی والے بتا رہے ہیں۔ ابھی ابھی منگو آئی تھی اور تیری جان کو رو رہی تھی۔ کمینے! تیری یہ مجال کہ تجھے اس گھر میں اپنی

حرکتیں کرنے کی جرأت ہو۔ میں کھڑے کھڑے تیری کھال کھینچ دوں گی۔ آنکھیں نکال دوں گی۔ تو کسی کو بُری نظر سے دیکھ تو سہی۔ تو نے کیا سمجھ رکھا ہے کیا مجھے تیرے کرتوتوں کا پتہ نہیں۔''

''میں نے کیا کیا ہے جی!'' وہ پھر چیخا۔

''ٹھہر جا، صاحب کو آ لینے دے آج تیری اچھی طرح درگت بنواؤں گی۔''

''ایسے ہی جی، خواہ مخواہ بولے جاتے ہیں۔''

خواہ مخواہ بولے جاتی ہوں۔ تو دیکھ تو سہی میں تیرا حشر کیا کرتی ہوں۔ تو شریفوں کے گھر میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ رذیلوں کی اولاد ہے۔ اس کالونی میں اور بھی ملازم ہیں کبھی کسی کی ایسی بات سنی۔ ہمارے بھی مرد ہیں آنکھ اُٹھا کر کسی کی طرف نہیں دیکھتے۔ حرام زادے! دنیا بھر کی خرابیاں تمہی لوگوں میں کیوں ہیں۔ اس لیے کہ تمہارے پاس کھانے کو نہیں ہے۔ سگریٹ کے بغیر تم لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔ فلم دیکھے بغیر تم لوگوں کو کھانا ہضم نہیں ہوتا اور غریب ہو کے غریبوں پر بُری نظر ڈالتے ہو۔ کوئی امیر آدمی ایسی حرکت کرے تو تم اُسے جینے نہ دو کہ اس کے پاس پیسہ زیادہ اس لیے ایسا کرتا ہے۔''

''کیا ہے جی، اس وقت سے بولے جا رہی ہیں.....'' وہ بڑبڑایا۔

''میری نظروں سے دور ہو جاؤ، ورنہ غصے میں مار بیٹھوں گی۔'' وہ دروازہ کھول کر جلدی سے باہر چلا گیا۔ باہر جا کر اونچی آواز میں بولنے لگا۔

بیگم برلاس کے گھر سے آوازیں آئیں۔ یہ کافی حیرت انگیز بات تھی۔ اس لیے ساتھ کے فلیٹوں والے ملازمین بھی نکل آئے تھے اور آ کر کریم بخش کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔ کریم بخش نے جیب سے ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا تھا۔ منہ پھلائے دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ جب بولتے بولتے بیگم برلاس خاموش ہو گئی تو ایک نے پوچھا۔

''کیا ہوا یار؟''

''کچھ نہیں بس ایسے ہی بیگم میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔'' اس نے سمجھا بیگم برلاس بول بول کر جا چکی ہے۔

''پھر بھی کوئی بات تو ہو۔''

''ہو کیا۔ ان کے شوہر جو کچھ کریں ٹھیک ہے یہ تو اندھی ہیں۔ نزدیک کی چیز تو انہیں نظر نہیں آتی۔ اب یہی دیکھو جب میری بیگم کراچی چلی گئی تھی۔ تو صاحب ہمیشہ رات کو دیر سے آتا تھا۔ سارا مہینہ اس نے باہر سے کھانا کھایا۔ مگر مجھے کہتا تھا پکا کے خود کھا جایا کرو۔ اتنے سگریٹ پیتا تھا کہ میں ٹکڑے اُٹھا اُٹھا کر تھک جاتا تھا۔ کیونکہ اُس کا حکم تھا کوئی ٹکڑا کہیں پڑا ہوا نہ رہ جائے۔ ورنہ بیگم کو پتا چل جائے گا اور تو اور اس نے سوٹا لگا کر اندر باورچی خانے کی طرف دیکھا اور تسلی کرنے کے بعد بولا۔

''یہ حرامزادی منگو ہے نا؟ یہ صاحب پر حلال ہے اور مجھ پر حرام ہے۔ ہر دوسرے دن صاحب اس کو لے کر اندر سے دروازہ بند کر لیتا تھا اور پھر یہ منگتی ہوئی اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ ایک دن صاحب کو شک ہو گیا کہ میں جانتا ہوں۔ مجھے اُس نے بہت سے پیسے دیے اور بولا ''بیگم کو پتا نہ چلے۔ جی یہ ساری گھر میں پھیلائی ہوئی گندگی صاحب کی ہے۔ عجیب و غریب دوست لے آتا تھا۔ ساتھ تاش کھیلتے تھے۔ سگریٹیں پیتے تھے۔ وہ حرافہ منگو میں نے اسے ذرا سا چھیڑ دیا حرام خور صاحب کے منہ کو لگ گئی ہے۔ جا کے میری شکایت بیگم سے کر دی۔'' وہ پھر بڑے بڑے سوٹے لینے لگا۔

''ہاں یار، ان بیگموں کا بس اپنے شوہروں پر نہیں چلتا تو نوکروں پر اپنا غصہ نکالتی ہیں۔'' دوسرا بولا۔

تیسرے نے کیا کہا اور اس مجلسِ شوریٰ میں کون سا قانون پاس ہوا بیگم برلاس سننے کے قابل نہ رہ سکی۔ وہ تو کھڑے ہونے کے قابل بھی نہ تھی۔ مگر جانے کس طرح اپنے بیڈ روم میں پہنچ گئی۔ خوبصورت آنکھوں والے خوش شکل، صاف ستھرے اور چمکدار آہو کو جب اندر کوئی چوٹ لگتی ہے تو چپکے چپکے گھل جاتا ہے۔ کوئی اس کے مرنے کی وجہ نہیں جانتا۔

ایک شیشہ ایسا بھی ہے ذرا سی ٹھوکر اسے ذرّوں میں بدل دیتی ہے۔ ایسے چُور چُور ہوتا ہے کہ سمیٹا نہیں جا سکتا۔ تسبیح کتنی بھی مضبوط کیوں نہ ہو، ایک موتی گرے تو ساری بکھر جاتی ہے..... دانہ دانہ ہو جاتی ہے۔

پھر کالونی میں کسی نے وہ پہلے والی بیگم برلاس نہ دیکھی ایک عورت رہتی تھی وہاں جس کے بال بکھرے ہوتے کپڑے سلوٹ زدہ ہوتے۔ جس کے چہرے پر وقت کی سلوٹیں تھیں اور ہونٹوں پر تالے۔ کُندن کُندن جسم میں ملاحتیں نہ تھیں چاند گہنا گیا تھا۔ گھر میں جا بجا گندگی پھیلی رہتی اور باورچی خانہ تو حد سے زیادہ گندا ہوتا۔ بلکہ ایک مریل اور مدقوق سا خانساماں ہمہ وقت کھانستا رہتا۔ سگریٹ پیتا رہتا۔ اندر باہر آتا جاتا رہتا۔ مہمانوں کو بدمزا چائے پلاتا رہتا اور کام چلتا رہتا.....؟

کالونی کی عورتیں کہتی ہیں بیگم برلاس کا تعویذ اُلٹ گیا ہے۔

شاعری

سکھا گیا کوئی جینے کا ڈھنگ کیا کہنا
نہ راس آئے مجھے راگ رنگ کیا کہنا
دمک رہی تھی کبھی بازوؤں کے گھیرے میں
تمہاری یاد ہے اب سنگ سنگ کیا کہنا
خزاں رسیدہ بہاروں کے سوگ میں تنہا
لگا گیا ہے تیرا ہجر زنگ کیا کہنا
ہمک رہی ہے مرے دل میں درد کی برکھا
فنا کے بعد بھی جاری ہے جنگ کیا کہنا
بہت سلیقے سے غم کو سنبھال رکھا ہے
کرے ہے حجلہ جاناں کو تنگ کیا کہنا
وہ چاندنی کے نگر میں بھی میرے ساتھ رہا
لو پانیوں پہ بھی آئے ہیں رنگ کیا کہنا
اس ارتباط محبت میں بے خودی کیسی
مرے لہو میں ملا دی ہے بھنگ کیا کہنا
وفا کی رسم میں ہم ہار کر بکے ہی نہیں
تمہارے شہر سے آئے ہیں سنگ کیا کہنا
میں اپنے عالم تنہائی میں بہت خوش تھی
مجھے بکھیر گیا شوخ و شنگ کیا کہنا
عذاب قریۂ جاں کا حساب کیسے دوں
دل فقیر بنا ہے ملنگ کیا کہنا
سنا ہے رات بھی جی بھر کے روئی میرے ساتھ
جو میرے کانوں میں بجتا ہے چنگ کیا کہنا
وہ سانس بن کے دھڑکتا ہے میری دھڑکن میں
مہک رہا ہے میرا انگ انگ کیا کہنا
گو تھک چکی ہوں مگر اس قدر ملول نہیں
زمانہ دیکھ کے ہوتا ہے دنگ کیا کہنا

تمہاری یاد کی مسند پہ بسمل ویراں
بھٹکتی بھیگتی راتوں میں جنگ کیا کہنا

بسمل صابری/ساہیوال

حقیقت زندگانی کا سنہرا باب کر جاؤ
نیا اک رنگ دے کر ہی مجھے نایاب کر جاؤ
نئی رم جھم خیالوں کی شب ماہتاب جیسی ہے
جو تم چاہو تو یہ منظر شب مہتاب کر جاؤ
تمہاری یاد کے بادل تو گھر آئے ہیں ساون میں
گھٹاؤ اب برس جاؤ مجھے شاداب کر جاؤ
مرے سیلاب گریہ میں تمہاری داستانیں ہیں
جو ممکن ہو تو اس پنہائی کو پایاب کر جاؤ
کہیں ایسا نہ ہو ملنے کی سب رسمیں بدل جائیں
نئی لے پر کوئی نغمہ سر مضراب کر جاؤ
بہت بے چین رہتی ہوں بہت بے خواب ہیں آنکھیں
اُتر کر روح میں میری مجھے سیراب کر جاؤ
یہ دنیا موت کی صورت ہے جانم تیرے جانے سے
مری یخ بستہ راتوں کو خیال و خواب کر جاؤ
محبت ایسا دریا ہے سمندر میں ہی گرتا ہے
میرے پاکیزہ جذبوں کو ذرا بے تاب کر جاؤ
تمہارے ہجر میں بسمل بہت برباد ہے جاناں
کسی بے باک لہجے میں رقم اک باب کر جاؤ

بسمل صابری/ساہیوال

سر منزل پہنچ کر ہم اسی اک مخمصے میں ہیں
ہمارے دوست جانے کیوں ابھی تک راستے میں ہیں
بہت ہیں مختلف کیفیتیں ان کے قرینے میں
عمل میں گو نہیں مخلص مگر وہ دیکھنے میں ہیں
مناظر کے اشاروں پر جوانی آ ہی جائے گی
ابھی تو دیکھنے والے نظر کے بچپنے میں ہیں
کہاں سے لائیں گے یکسانیاں تشکیل پر اپنی
ہمارے عکس کتنے اس شکستہ آئینے میں ہیں
نئے افکار سے ہم استفادہ کر نہیں سکتے
زیاں کے شاخسانے رات دن کے سوچنے میں ہیں
کہاں پہچان قائم کر سکیں گے ان سے ہم ثاقب
بہت سے اجنبی چہرے ہمارے قافلے میں ہیں

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

سب کہاں موتیوں میں ڈھلتے ہیں
اشک جو آنکھ سے نکلتے ہیں
ہم ہی ہوتے ہیں بے وفا، ورنہ
دل کہاں راستے بدلتے ہیں
تھام کر ہاتھ، بارہا دیکھا
گرنے والے کہاں سنبھلتے ہیں
میں نہیں ہوں تو تیری آنکھوں میں
پھر یہ کیسے دیے سے جلتے ہیں
جان دینا اگر نہیں آساں
پھول شاخوں سے کیوں نکلتے ہیں

ریگ زاروں میں پاؤں جلتے تھے
شہر میں جسم و جان جلتے ہیں
آنکھ بھر کر جو دیکھ لیں تجھ کو
دل میں کیا کیا گماں مچلتے ہیں
شاخِ دل پر کھلے ہوئے یہ پھول
تیری چشمِ کرم سے پلتے ہیں
چاہتے ہیں تری خوشی ایوبؔ
ہم ترے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ڈاکٹر ایوب ندیم/لاہور

میری ستی جاگ پئی اے میں نہیں ہن جھکنا

وِنج گئے کمبخت کمینے
دھرتی ماں دی لوری
آپ سوداگر راتوں راتی
ساڈے ہتھ ڈگوری
میری ستی جاگ پئی اے
میں تے ہن نہیں رُکنا
ہن جھکے گا ظالم ای بس
میں تے نہیں ہن جھکنا
ہن کوئی تلوار جے آوے
ڈکن ذرا سوچ کے
ہن کمینہ، دانے آوے
پھکن ذرا سوچ کے
میں تے نہیں ہن رُکنا
میں تے نہیں ہن جھکنا

بابا سہوتہ/لاہور

رکھ دے وہ اگر ہاتھ کی تحریر اُلٹ کر
رہ جائے مرے خواب کی تعبیر اُلٹ کر
کس بات پہ ہے زَعم مرے چارہ گروں کو
تدبیر کو رکھ دیتی ہے تقدیر اُلٹ کر
بن جاتا ہے تریاق کبھی زہرِ ہلاہل
وہ چاہے تو رکھ دیتا ہے تاثیر اُلٹ کر
جانا تھا عدم کو وہ مسافر تھا عدم کا
آتا ہے ہدف سے بھی کبھی تیر اُلٹ کر
کرتا ہے مرے جُرم پہ وہ صرفِ نظر بھی
پھر خود ہی لگا دیتا ہے تعزیر اُلٹ کر
تصویر کا اِک اور بھی رُخ ہوتا ہے خورشیدؔ
اِک بار اگر دیکھ لے تصویر اُلٹ کر

انور بیگ میلسوی/میلسی

ہاں دلوں کے غار سے پھوٹے گی اک دن روشنی
خارزاروں پر برس جائے گی برکھا نور کی
سامنے دریا، تعاقب میں کوئی لشکر مرے
اس گھڑی مولا عطا ہو اک عصائے موسوی
آؤ اب اس داستاں کو اک نئی ترتیب دیں
خستہ دیواروں میں چن دیں اب حلالِ اکبری
گم پرانی یاد میں چلتا رہا جو دشت میں
آ گئی پھر وہ گلی، اے بے خودی، اے بے خودی
میں دیے کی لو کی صورت رات بھر جلتا رہوں
شاعری ہے زندگی اور زندگی ہے شاعری
خوش گمانی کا دیا دل میں جلائے رکھ سحابؔ
صبح کی اُمید پر غالب نہ آئے تیرگی

اسلم سحاب ہاشمی/ساہیوال

میں دورِ راہِ زیست میں اتنا نکل گیا
لمحات کا جزیرہ سمندر نگل گیا
یہ ظرف کی ہے بات کہ خوش دیکھ کر ہمیں
کوئی تو خوش ہوا ہے کوئی شخص جل گیا
سوچو اگر تو اس میں سبق ہے نہاں کوئی
سورج طلوع روز ہوا روز ڈھل گیا
آتش فشاں پہاڑ کا انجام دیکھ لو
غصہ مزاج جو بھی تھا خود ہی پگھل گیا
یہ بھی کرم خدا کا ہے دنیا کی بھیڑ میں
ٹھوکر تو کھائی میں نے مگر پھر سنبھل گیا
سنتا نہیں ہے بات مری کوئی اب یہاں
جادو کسی کی آنکھ کا سب پر ہی چل گیا

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

تھوڑی پیاس رہنے دو

تیرگی کہ بے حد ہے
اک چراغ رہنے دو
اس خزاں میں مصنوعی
سا گلاب رہنے دو
حبس کا یہ عالم ہے
سانس رُکتی جاتی ہے
نیم وا کوئی کھڑکی
آس پاس رہنے دو
نا اُمید موسم میں
اس دلِ شکستہ میں
کوئی آس رہنے دو
نیند کو ترستی سی
ان اُداس آنکھوں میں
کوئی خواب رہنے دو
اس جہاں کے انساں کو
خوب پڑھ چکے ہیں ہم
ہو چکا جو فرسودہ
وہ نصاب رہنے دو
وصل کا یہ رنگیں جام
تھوڑی پیاس رہنے دو

مت بڑھاؤ اب آگے
عشق کے جہاں والو
تھوڑی پیاس رہنے دو
ڈاکٹر غزالہ خاکوانی/ملتان

نجانے کس لیے اترا رہے ہیں
نوالے قرض کے ہم کھا رہے ہیں
جو ہم پر جان دینا چاہتے تھے
خفا ہو کر وہ دیکھو جا رہے ہیں
مقدر کا لکھا کہیے کہ سازش
اُجالے تیرگی پھیلا رہے ہیں
بنایا تھر جنھوں نے سرزمیں کو
وہ کتے دودھ میں نہلا رہے ہیں
کبھی سوچے نہیں جو ہم نے یارو
وہ منظر دیکھنے میں آ رہے ہیں
یقیناً وہ بھی آئیں گے پلٹ کر
پرندے لوٹ کر جو آ رہے ہیں
عجب جمہور ہیں ہم لوگ شاہدؔ
بنامِ پیار دھوکے کھا رہے ہیں
ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

تنہا آئے تنہا جانا ہے یارو
دنیا ایک مسافر خانہ ہے یارو
آنکھ کھلی تو اصل حقیقت دیکھیں گے
جیون کیا ہے خواب سہانا ہے یارو
ایسے اُس کا رستہ دیکھتا رہتا ہوں
جیسے اس نے لوٹ کے آنا ہے یارو
کچھ لوگوں کو حال سنانے کا مطلب
دیواروں کو حال سنانا ہے یارو
جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا آصفؔ
مشکل وقت سے کیا گھبرانا ہے یارو
آصف نیاز/لاہور

یوں بدلا جیون ڈھنگ پیا
موہے چڑھ گیا ترا رنگ پیا
تری چاہت کی اس برکھا میں
مورا بھیگا ایک اک انگ پیا
تو آ جا تخت ہزارے سے
آباد ہے من کا جھنگ پیا
اپنے اس سونے آنگن سے
اب آ گئی ہوں میں تنگ پیا
ترے نام کی میں نے پہنی ہے
اک انگوٹھی، اک ونگ پیا
میں کیسے ٹھوکر کھاؤں گی
جب تم ہو میرے سنگ پیا
لبنیٰ صفدر/لاہور

رونقیں ہیں بڑی اجنبی شہر میں
اک ہے تیری کمی اجنبی شہر میں
بے بہا حسن ہے پھر بھی جانِ غزل
کب ہے تجھ سا کوئی اجنبی شہر میں
تیرے ہونے کا احساس ہے جا بجا
کتنی ہے دلکشی اجنبی شہر میں
تیری یادوں کی کھلتی گئیں چھتریاں
جب بھی بارش ہوئی اجنبی شہر میں
کچھ پرندوں، درختوں، عمارات سے
ہو گئی دوستی اجنبی شہر میں
اجنبی شہر بھی اجنبی ہی رہا
ہم تو تھے اجنبی، اجنبی شہر میں
جب بھی سوچا تجھے آ گئی خود بخود
میرے لب پر ہنسی اجنبی شہر میں
مجھ کو تیرے سوا کچھ بھی دکھتا نہیں
اتنی ہے روشنی اجنبی شہر میں
چار دن تیرے بن ایسے گزرے لگا
کٹ گئی زندگی اجنبی شہر میں
(۲۰ اگست ۲۰۱۸ء کو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں آوارگی کے دوران لکھی گئی)
حسن عباسی/لاہور

فروغِ ادب کے لیے وقف
براہِ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری، نثر) کمپوز کروا کے "ان پیج" میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com
آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کرسکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرِ تعاون مبلغ/-1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔
برائے خط کتابت/ ترسیل زر/ رابطہ
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0333-4377794 - 042-37322996
بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
بک ڈائجسٹ لاہور
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

انٹرویو: رخشندہ نوید

ارژنگ: سب سے پہلے اپنے ادبی و سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے؟

رخشندہ نوید: بہت سارے بہن بھائیوں کی اکلوتی بہن، باذوق والد کی بیٹی اور والد کے پاس میں نے بہت ساری اردو فارسی کی کتابیں گھر میں دیکھیں بچپن میں۔ اور دھیرے دھیرے میں نے ان کتابوں کو چھوا، وہ مجھے پڑھنی نہیں آتی تھی، مگر مجھے اچھی لگتی تھیں۔ تو بہت سارے بہن بھائی تھے، بہت مزے کا گھر تھا۔ لیکن ان میں سے میں نے گھر کے چھوٹے سے کمرے پہ قبضہ کرلیا تھا۔ سکول کے زمانے میں کرلیا تھا۔ اور وہاں میں نے اپنی پسند کی کتابیں جو مجھے دیکھنے میں اچھی لگتی تھیں۔ جن کے ٹائیٹلز، جن کے کورز وہ سب میں نے جمع کر کے ایک ٹیبل پہ رکھی تھیں۔ اور تھوڑی میں منفرد ضرور تھی اپنے گھر سے۔ اپنے ماحول سے بھی آپ کہہ لیں، اپنے بہن بھائیوں سے بھی آپ کہہ لیں، مطلب یہ کہ میرے شوق عجیب ہی تھے۔ میں اب سوچتی کہ اگر میں شادی سے پہلے تک کی اگر میں باتیں کروں، پیدا ہونے، سکول کی، کالج و یونیورسٹی کی تو کچھ اور قسم کا میرا اسٹائل ضرور تھا۔ حتیٰ کی میرے بہن بھائی بچپن سے ہی میرے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنے آپ کو کچھ سمجھتی ہوں کہ یہ اپنے آپ کو میم سمجھتی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ اب اتنی عمر گزارنے کے باوجود بھی مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کسی بھی چیز سے۔ چونکہ میں ویسی کی ویسی ہوں۔ ماحول بھی بدلے، گھر بھی بدلے، ساری روٹین بھی بدلی، لیکن میں وہی کی وہی رہی۔ لاہور کالج سے پڑھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا۔ پنجاب یونیورسٹی تک آتے آتے میں کافی معروف شاعرہ ہوگئی تھی۔ ٹی وی میں بھی ایک دو پروگرام جو ینگسٹرز کے تھیمیں انٹروڈیوس ہوگئی تھی۔ اور والد صاحب نے شائد دیکھ لیا تھا یا گیس کرلیا تھا کہ میرے اندر لکھنے کا کچھ کیڑا ان کو دکھائی دیا۔ تو انہوں نے باقی سب سے زیادہ مجھ پہ نظر کرم ضرور رکھی۔ جیسے وہ مجھ سے انگریزی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ پھر مجھے اقبال پڑھاتے تھے، ہمارے گھر میں بڑا خوبصورت لان تھا۔ سمن آباد میں میں کلاس سکس میں تھی تو وہاں ہمارے والد نے گھر خریدا تھا۔ بہت خوبصورت اور بہت پیارا گھر اور بہت خوبصورت لان والا گھر اس وقت ایک ڈریم ٹروا تنا خوبصورت گھر کوئی بھی کہہ سکتا تھا۔ اس گھر میں بہت خوبصورت لان تھا۔ مجھے شاعر بنانے میں اس لان کا بہت ہاتھ ہے۔ اس میں اتنے خوبصورت پھول تھے کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ کہ میں گلاب اور موتیے کی پرات بھر بھر کر اتارا کرتی تھی۔ یہ میرا شوق تھا۔ ہر روز سکول جانے سے پہلے میں تھیلا بھر کر موتیے کا اتارتی اور پھر گجرے بھی بناتی اور پھولوں سے تو مجھے بہت پیار تھا۔ یہ تھوڑا سا اور ٹے میں ملا آپ کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے والد ہر موسم میں جو ہمارا مالی چاچا تھا اس سے بیل تبدیل کرواتے تھے موسم کے لحاظ سے۔ کہ اس موسم میں یہ بیل لگاؤ اس پہ یہ پھول آئیں گے تو رات کے وقت آم کا پیڑ تھا ہمارے لان میں اور بھی کچھ تھے۔ اس کے ہری لائیٹ لگا کر ایک شاور لگوا دیا تھا اس کے نیچے۔ پھر مجھے بھولتا نہیں کہ ہم سب بہن بھائی اس لان میں گرمیوں میں چارپائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے۔ اتنا مزے کا ٹائم تھا اور میرا پڑھنے کا کریس تھا وہ تب شروع ہوگیا تھا۔ کتابیں پڑھنا وہاں ہمارے سمن آباد میں ڈونگی گراؤنڈ ہے منی مارکیٹ ہے۔ اس میں ایک لائبریری ورائٹی جو کتابیں پڑھنے کے لئے دیتی تھی۔ میں وہاں سے بہت کتابیں لیتی تھی۔ پھر میں چوری چوری سائیکل بہت چلاتی تھی۔ اس زمانے میں مجھے پن بالز بنانے کا شوق ہوا۔ حالانکہ ہمارے ابا کی کافی سختی تھی ہم پر۔ اور کوئی الٹا سیدھا کام کرنے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پورا دن اجازت لینے اور امی کی سفارش میں ہم ڈرتے تھے ابا سے۔ اور شائد ہم ابا سے ایک دو بار ہی گلے ملے ہوں۔ ابا کے پاس بیٹھتے تھے ہم، بہت باتیں کرتے تھے۔ ہمارے لان کا جو ایک ایک پتہ تھا وہ دھلواتے تھے پائپ سے۔ ہم لان میں بیٹھتے تھے اور ابو کوئی ایک اقبال کا شعر لے کر پوچھتے تھے کہ بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے۔ مجھے عربی کی، فارسی کی گردانیں یاد کرواتے تھے۔ بچپن اسی طرح گزرا اور پھر میں نے قلمی دوست بنائے۔ یہ کالج کے زمانے کی باتیں ہیں اور میں انارکلی بازار کے شروع میں جو دو کانیں ہیں سٹیشنری کی وہ میری پسندیدہ جگہ تھیں۔

ارژنگ: عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

رخشندہ نوید: عملی زندگی کا آغاز تو میں نے کالج کے زمانے سے ہی آس پاس جو رسائل تھے، جو میری لکھی ہوئی شاعری تھی، افسانے بھی میں لکھتی تھی۔ وہ میں ان کو جا کر دیتی تھی۔ چلڈرن رسالے، اردو ڈائجسٹ تھا ہمارے سمن آباد میں۔ عملی زندگی بھی اسی کو کہتے

ہیں کہ کچھ کرنے کا ارادہ کرلیا تو شروع سے ہی ایسا ذہن میں نہیں تھا کہ ایک عام سی زندگی گزارنی ہے، جہاں جہاں زندگی مجھے لیتی جائے گی، جیسا میں نے بتایا کہ ایم اے کے دوران شادی ہوئی تو شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد میں نے اپنا ماسٹرز مکمل کیا۔ اور اس وقت میرے خاوند کیمیکل انجینئر ہیں۔ تو کالا شاہ کاکو میں اتحاد کیمیکلز میں ہمیں ایک گھر مل گیا تھا ان کی کالونی میں وہاں سے میں روز یونیورسٹی آیا کرتی تھی۔ اور میں واپس جاتی تھی تین چار بجے۔ تو اگر آپ پھر کہتے ہیں کہ عملی زندگی جاب کرنے کو تو وہ مجھے مستقل جاب کرنے کا کیڑا ماسٹرز کرنے کے بعد لگ گیا تھا۔ کہ میں کہیں پر جاب کروں۔ مگر ان دنوں قدرت کی طرف سے ایک دو جابز ایک تو پی ٹی وی اور دوسری ایک آدھ سرکاری جاب ایک تو لیٹر ہی مجھ تک نئی پہنچ پائے۔ میں نہیں کر پائی۔ لیکن پھر یہ کہ ہماری بیٹیوں کے بعد اس دوران میں لکھتی تو رہی مستقل میں لکھتی رہی، لکھنے کا عمل جاری رہا اگر اسے آپ عملی زندگی کہتے ہیں تو یہ عمل بھی جاری رہا، پھر میں نے ٹیچنگ کی، پھر میں نے جو ساتھ چھوٹی بیٹیاں تھیں مگر مجھے چین نہیں آتا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں کچھ نہیں کر رہی، مجھے کچھ کرنا چاہیئے، کوئی جاب کرنی چاہیے، اس طرح نیچ کیا، دھیرے دھیرے ایڈورٹائزا ایجنسیوں میں کام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کتابیں مرتب کرتی رہی۔ چار کتابیں اردو کی آئیں، غزلیں، نظمیں۔ بڑی میں اس معاملے میں خوش قسمت رہی کہ نہایت بہترین لوگوں نے اس پر رائے دی۔ جس میں منیر نیازی، احمد ندیم قاسمی، خورشید رضوی، مشتاق یوسفی، زاہد حسن ان تمام نے میری کتابوں پر فلیپ لکھے۔ سو عملی زندگی آج تک چل رہی ہے۔ آج بھی میں کام بھی کر رہی ہوں۔ لکھ بھی رہی ہوں۔ پڑھ بھی رہی ہوں۔ اور زندگی یہی ہے کہ مجھے لگتا ہے۔ باقی سب کچھ بھی ہے۔ روایتی بھی لائف میں سب کچھ ساتھ ساتھ چلا۔ مگر یہ والا جو لائف کا پارٹ تھا مجھے لگتا ہے۔ میں سائل میں بھی یہی ہوں۔ دیکھنے میں بھی یہی ہوں۔ اصل میں بھی یہی ہوں۔ میری شناخت یہی ہے۔

اس کے علاوہ ہمیشہ ہی مجھے جاب کا کیڑا رہا ہے۔ جیسے جیسے مجھے ٹائم ملا۔ چونکہ ایک فیملی لائف پوری تھی تو جہاں جہاں کہیں مجھے وقت ملا۔ جن سالوں میں، جن مہینوں میں، ان میں میں نے ضرور اس طرح کا پریکٹیکل کام کیا۔ میں نے کالم بھی لکھے۔ نوائے وقت میں میرے بہت اچھے کالم چل رہے تھے۔ اسد اللہ غالب صاحب ایڈیٹر تھے۔ بہت سارے کالم میرے چھپے۔ ان کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ دکھتی رگ کے نام سے میں کالم لکھتی تھی۔ اب میں سمجھتی ہوں کہ شائد وہ میری لائف کی بہت بڑی غلطی تھی یہ سوچنا کہ یہ مجھے پیسے نہیں دیتے تو میں ان کے لئے کیوں لکھوں تو میں نے غصے میں آکر وہ کام چھوڑ دیا۔ چونکہ میں نے ماسٹرز کیا ہوا ہے جرنلزم میں۔ وہ میرا سبجیکٹ بھی تھا۔ مجھے بہت اچھا بھی لگتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو میں نے کالم بنایا۔ ساری کٹنگز میرے پاس رکھی ہیں۔ پھر میں نے جنگ اخبار کے جو ایڈیٹر تھے انہوں نے کہا کہ آپ فیچر بنائیں۔ میں نے ان کو بہت اچھے اچھے فیچر بنا کر دیئے۔ لیکن پھر وہی بات کہ میں اپنی گاڑی پر جاتی تھی، اپنے پیپر، اپنا پن لگا کے تصویریں لگا کر۔ ہر چیز مہیا کر کے میں ان کو دیتی تھی۔ لیکن ان کے بہت تھوڑے سے پیسے مجھے ملتے تھے۔ پھر وہ بھی مجھے لگا کہ یہ بھی کوئی کام ہے۔ یہ تو انسلٹنگ ہے۔ حالانکہ اگر میں دیکھوں تو وہ بھی کمال کے فیچر بنائے ہوئے ہیں میں نے۔۔ مشرق اخبار میں بھی چھوٹے چھوٹے ٹاپکس پر میرے مضامین چھپتے رہے۔ یہ پرانی باتیں ہیں ساری۔ پھر کچھ ایجنسیز میں میں نے کاپی رائیٹنگ کا کام کیا۔ چار پانچ سال سے میں اردو زبان پڑھا رہی ہوں۔ تو کام کرنا اس لحاظ سے مجھے فائدہ مند لگتا ہے کہ ایک تو یہ کہ آپ صحت مند رہتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو پوری زندگی کاموں کے لئے کم پڑتی ہے۔ بس اب میں سوچوں تو لگتا ہے کہ وقت بہت جلدی گزر رہا ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو دن کے بارہ اٹھارہ گھنٹوں میں آپ کیا کریں گے۔ مانگ آورز آپ کسی کو دے دیتے ہیں۔ معاوضہ بھی آپکو اچھا ملتا ہے تو آپ شفٹ کر رہے ہیں اپنی ذات کا۔ تو میرے خیال میں کام کرنا ضروری ہوتا ہے آپ کی شخصیت کے لئے۔ کر کے بھی میں نے دیکھی ہے جاب۔ جاب نہ کر کے بھی میں نے دیکھی ہے۔ تو یہی جب آپ صبح اٹھ کر تیار ہوتے ہیں۔ ڈریس اپ ہوتے ہیں۔ باہر جاتے ہیں۔ کمیونٹی میں ملتے ہیں نئے لوگوں سے۔ آپ خالی ذہن نہیں رہتے۔ منفی خیال آپ کے ذہن میں کم آتے ہیں۔ تو اس کے لئے میں سمجھتی ہوں کام کرنا ضروری ہے۔

ارژنگ: ادب سے شوق کی ابتداء؟

رخشندہ نوید: ادب سے شوق کا سٹارٹ جیسا کہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں بھی بتا دیا مجھے تو لگتا ہے کہ میں ایسے ہی پیدا ہوئی تھی۔ جو کچھ بھی تھا میرے اندر ہی تھا۔ اور وہ روز اول سے ہی تھا۔ سکول کے زمانے میں اتنی ڈائریز سنبھالا کرتی تھی۔۔ کچھ کچھ لکھ کر۔ مجھے بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ میں کیا لکھتی ہوں۔ اچھی سی خوبصورت سی تحریر۔ موثر تحریر۔ رومانٹک تحریر۔ لیکن یہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ شاعری ہے۔ ابھی شاعری مجھ پر کھلی بھی ہیں تھی۔ مجھے اس کا ادراک بھی نہیں تھا کہ شاعری کیا

ہوتی ہے۔ جب مجھے پتہ چل گیا پھر تو میں سیریس ہو گئی ۔پھر جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ سارے اساتذہ کی کتابیں بھی میرے ٹیبل پر ہوتی تھیں۔ نئے لکھنے والے ناصر کاظمی، عظمیٰ زیدی اور میں کن کا نام لوں جن کو میں نے اسی زمانے میں پڑھ لیا تھا۔ منیر نیازی۔ امجد صاحب سب کو۔ اس کے بعد ادب میں شاعر تو میں ہوگئی۔ بن گئی، میں روز اول سے ہی بن کے پیدا ہوئی۔ مگر یہ شادی کے دس برس بعد تک میں لکھ لکھ کر رکھتی رہی ۔لیکن پھر اس کا کریڈٹ میرے خاوند کو بھی جاتا ہے انہوں نے مجھے کہا کہ اس کو تم کتاب کرو۔ پھر میں ملی نجیب صاحب، خالد صاحب، منیر نیازی اور قاسمی صاحب ،سب کو ملی۔ پھر میری پہلی کتاب چھپی اور اسکو اچھی پزیرائی ملی۔ پھر میری دوسری کتاب پھر تیسری چوتھی۔ اگر میں دیکھتی ہوں کہ مجھے صرف آپ کو ہی انٹرویو دینا ہوتا۔ تو میری کتابوں پر بہت سے لوگوں نے ان پہ اچھا اچھا لکھا ہوا ہے۔ کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ جیسے بعض معاملوں میں میں بڑی خوش قسمت رہی ہوں۔ میری چاروں کتابیں، ابھی میں پنجابی کا ذکر بعد میں کروں گی۔ بڑے شہروں میں ان کی بڑی بڑی تقاریب ہوئیں۔ لاہور، ملتان، اسلام آباد اور فیصل آباد ان چاروں شہروں اور کہاں پشاور میں بھی میری کتاب کی ایک تقریب ہوئی۔ تو ان پر جو بیسٹ لکھنے والے رائٹرز تھے انہوں نے اس کو سند کیا۔ لیکن میرا اپنے مزاج میں رہنا کچھ زیادہ ہے زرا۔ کہ میں نے وہ سب چیزیں جمع بھی نہیں کیں۔ وہ پتہ نہیں ویڈیوز کہاں ہیں جن کے اندر وہ مضامین ہیں۔ کچھ میرے پاس ہیں۔ بہت اچھے مضامین جو پڑھے گئے وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ اب میں ان سے کیسے کہوں دوبارہ ان کے پاس ہوں نہ ہوں، بس پھر وہ مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور شکر ہے خدا کا کوئی آج حسرت نہیں ہے بہت مشاعرے پڑھے ہیں۔ انٹرسٹی پڑھے ہیں۔ دوسرے شہروں میں پڑھے ہیں۔ اس کے بعد اس سفر میں دھیرے دھیرے میں اتنا آگے تک گئی کہ میں پاکستان کے باہر سب مشاعرے میں پڑھ چکی ہوں۔ کیا دبئی مشاعرہ، کیا جدہ مشاعرہ، کیا قطر مشاعرہ، کیا USA کا اپنا مشاعرہ علی گڑھ والوں کے مشاعرے ،دیگر حلقہ احباب نیویارک کے مشاعرے کچھ بھی ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ نے عطا نہیں کیا۔ کچھ سال سے پھر آپ کا پیٹ بھرنا بھی چاہیئے ۔آپ نے بہت پڑھ لئے مشاعرے اب اوروں کو بھی موقعے ملنے چاہئیں۔ میں پرسو بھی نہیں کرتی۔ میں دوسرے کاموں میں بھی بزی ہوں۔ مشاعرے کا اب وہ معیار بھی نہیں ہے۔ اور طرح کی شاعری اب مشاعروں میں چلنے لگی ہے۔ ہوسکتا ہے جو میں اب لکھ رہی ہوں وہ مشاعرے کی شاعری ہو بھی نہ۔ تاہم اس کے بعد میں پنجابی شاعری کی بات کروں گی۔

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

رخشندہ نوید: 2018 میں میری پنجابی کی کتاب آئی ھالی آہ بسم میں آنا ہی۔ اس کی بھی ملتان میں تقریب ہوگئی ہے۔ لاہور میں بھی ہوگئی ہے۔ لیکن ابھی باقی ہے ایک دو شہروں میں۔ اسکو بھی پذیرائی ملی میری توقعات سے زیادہ ۔ میں ٹھوس پنجابی گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا ننھیال گرداس پور کا ہے تو میں پنجابی سن کر ہی بڑی ہوئی ہوں۔ میرے والد امرت سر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ پتہ نہیں کیسے میں بہن بھائیوں سے تھوڑی منفرد نکل آئی ۔ میٹرک تک مجھے انگریزی سکول میں پڑھایا گیا۔ مجھے میرے بڑے بھائی انگریزی پڑھاتے تھے ۔میری پرورش میرے بڑے بھائی نے کی ہے ایک اچھے چائلڈ کی طرح۔ میں پنجابی نہیں بولتی تھی۔ مجھے پنجابی نہیں بولنی آتی تھی۔ میں پنجابی سنتی تھی۔ میری دادی بولتی تھی پنجابی بڑے محاورے والی۔ تو اردو شاعری کرتے کرتے آپ کہہ لیں کہ میں پنجابی لکھتی ضرور رہی۔ لکھ لکھ کے رکھتی رہی۔ اس کے لئے 2018 لکی ثابت ہوا۔ پھر اس کو میں نے کتابی شکل دی۔ زاہد حسن نے میری بہت مدد کی۔ میری ڈکٹیشن کو درست کیا۔ اور وہ کتاب چھپ گئی ہالی آہ بسم میں آنہ ہی۔ اسی نظم کے نام پر میں نے کتاب کا نام رکھا۔ وہ نظم مجھ سے بہت بار سنی گئی ہے۔ میں پنجابی کی کہانی بھی لکھ رہی ہوں۔ اس کے علاوہ جہانگیر بکس نے ویلنٹائن پر مجھ سے مرتب کروائی تھی۔ نام مجھے یاد نہیں۔ کتاب بس انہی کے پاس ہے۔ میرے پاس بھی ایک کاپی پڑی ہوئی ہے۔ ویلنٹائن کے حوالے سے میں نے اس میں ڈھیر ساری شاعری ساتھ میں ایک کہانی بھی شامل تھی۔ اس کا انتخاب بھی جہانگیر بکس نے کروایا تھا۔ اسے ہم چھو نہیں سکتے وہ بھی بہت خوبصورت کتاب ہے۔ میرے پاس بھی رکھی ہوئی ہے۔ سٹالز پر بھی بہت رکھی ہوئی ہے۔ تو یہ کام ابھی تک کر رہی ہوں۔ افسانہ بھی لکھ رہی ہوں۔ چھپے بھی ہیں۔ المیہ افسانہ پہلی رات کے نام سے میرا افسانہ شائع ہوا ہے۔ اور اس پر بہت لے دے بھی ہوئی ہے۔ میرے موضوعات جو ہیں میں ان سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ بہت بولڈ آئیڈیاز مائنڈ میں آجاتے ہیں۔ بحرحال لکھنے کے معاملے میں کبھی ڈری نہیں ہوں۔ شاعری میں بھی میں بہت احتیاط سے قدم اٹھانے والا انسان ہوں۔ مگر میں لکھنے میں خود کو بہت ڈھیل دیتی ہوں۔ خود کو آزاد چھوڑ دیتی ہوں کہ جو من میں آتا ہے لکھو کیوں نہ لکھوں۔

ارژنگ: آپ نثر نگار بھی ہیں، شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

رخشندہ نوید: جی شاعری اور نثر جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو دونوں کو ساتھ ساتھ لکھا۔ شروع شروع میں میں بہت طویل افسانے لکھتی تھی۔ میں نے رسائل کو دیئے۔ وہ چھپے بھی۔ آہستہ آہستہ میں شاعری تک محدود ہوگئی۔ بیچ میں صحافتی کام میں نے کیا۔ کالم لکھے فیچر بنائے۔ لیکن زیادہ میں نے شاعری ہی کی۔ غزل، نظم، گیت۔ ٹی وی کے لئے گیت بھی میں نے لکھے۔ ابھی کچھ عرصہ سے وہ ہوتا ہے نا کہ ذہن میں کچھ کہانیاں ہوتی ہیں، کچھ افسانے ہوتے ہیں۔ مجھے اس کو آغاز کرتے کرتے کافی ٹائم لگ گیا۔ خود سے مجھے شکایت بھی ہے کہ میں بیچ بیچ میں پتہ نہیں کہاں گم ہو جاتی ہوں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ میں کچھ بھی لکھوں۔ شاعری ہو کچھ بھی ہو۔ شوخی میں نہیں کہہ سکتی۔ ایک اچھا موڈ آپ کہہ لیں۔ میں لکھ نہیں پاتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں جی ہم اداس ہو گئے۔ غمگین ہوں گے تو آپ زیادہ لکھ سکتے ہیں۔ ہر تخلیق کار کا اپنا اپنا طریقہ کار ہے۔ تو جب تک میں تھوڑی سی فریش نہ ہوں۔ میں نہیں لکھ پاتی۔ وہ بھی میں اسی وقت لکھوں گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ والی حالت آنے میں وقت لگ جاتا ہے۔ یا میں ست ہو جاتی ہوں۔ مجھے خود سے شکایت ہے کہ میں اس سے زیادہ کام کر سکتی تھی۔ فیلیٹی بہت ہے مجھ میں۔ مگر پتہ نہیں کیوں I am stupid۔

ارژنگ: الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

رخشندہ نوید: جی اس سے انکار نہیں ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری ہو گئی ہے۔ پہلے تو یہ تھا کمپیوٹر تھا۔ لیپ ٹاپ آ گیا۔ پھر ٹیب آ گیا۔ اب فائنلی ایک موبائل کی شکل میں دنیا جہان آپ کی مٹھی میں آ گیا ہے۔ آپ کچھ پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ فلم دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کتاب پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ کوئی معلومات لینا چاہتے ہیں۔ آپ کچھ سرچ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آرام دہ تو یہ ہے۔ اب فیس بک ہے، انسٹاگرام ہے، آپ کے پیجز ہیں، آپ کی ویب سائیٹس ہیں۔ آپ کی پبلسٹی کی میڈیم جو ہے وہ اب سارے یہی ہیں تو ان سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ ایسا تو ہے کہ جس نے مشہور ہونا ہے وہ اپنی کوئی ویڈیو وائرل کروائے۔ وہ اپنی شاعری جو ہے اس کو فیس بک پر لگائے۔ یوٹیوب پر چھوڑے۔ اپنی کوئی سائیٹس بنائے۔ یہ تمام چیزیں آج کا دور ہی یہی ہے کیا کیا جائے۔ لیکن کیا کہ میں تو تھوڑی سی پرانے ذہن کی ہوں۔ اس کو آپ امتزاج کہہ لیں۔ یہ جو مٹھی میں دنیا ہے یہ بھی ہے میرے پاس۔ اس کو بہت استعمال بھی کرتی ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اس میں کامیاب نہیں ہوں دل چاہتا ہے ایک سیکرٹری ہو میرے پاس۔ میرے تمام امور وہ سنبھالے اور میں صرف لکھوں۔ میں لکھ کے رکھ دوں۔ وہ میرے پیپر کونیٹ کرے۔ وہ میرے پیپر کو ٹائپ کرے۔ وہ اس کو فیس بک پر لگا دے۔ پھر وہ اسکو میرے پیج پر لگا دے۔ اب میں سمجھتی ہوں کہ جب سے میں اس میں آئی ہوں دلچسپی میں تو میں نے بہت ٹائم ضائع کیا ہے۔ اس میں بہت ٹائم لگ جاتا ہے آپ کا۔ مطلب یہ کہ میں تو ساوی زندگی ان کاغذوں کے جنگلات سے باہر ہی نہیں نکل پائی۔ کبھی تو مجھے غصہ آتا ہے کہ یہ میں کیا ہوں کہ میرے ہر طرف کاغذ پڑے ہیں۔ میں نے شادی کے بعد کئی گھر بدلے ہیں ان میں سب سے زیادہ رش میری کتابوں کا ہی ہوتا ہے۔ سٹورز بھی بھرے ہوتے ہیں۔ کائن بھی بھر بھر کے رکھتی ہوں۔ کتابیں بہت زیادہ ہو گئی ہیں۔ ہر کمرے میں بھی کتابوں کے ریک ہیں۔ میرے لئے کتابیں بچوں کی طرح قیمتیں ہیں، میں ان کو کسی کو دینا نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی ان کو چھیڑے۔ ہمارے گھر میں بچے آتے ہیں تو میں نے ان کو اپنی کتابوں کو چھیڑنے سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔ باقی چیزیں ٹھیک ہیں آپ کھیلو کودو لیکن میری کتابوں کو نہیں چھیڑنا۔ کتاب پڑھنے کا اپنا ہی مزا ہے۔ آپ کسی کونے میں بیٹھے ہو، کتاب بھی پڑھ رہے ہو، ساتھ میں کچھ کھا پی بھی رہے ہو۔ گرمیوں کی دوپہر ہو، سردیوں کی رات ہر کتاب پڑھنے کا اپنا ہی مزا ہے۔

ارژنگ: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

رخشندہ نوید: تخلیقیت میرا خیال ہے کہ جو شاعر ہے ان کو اللہ کی عطاء کردہ ہے، وہ شعر کہتا ہے، کوئی نظم، کوئی غزل کہتا ہے، یہ اس کے ذہن میں اترتے ہیں۔ یہ سب خدائی معاملہ ہے۔ میری 100 فیصد کئی نظمیں ایسی ہیں جو یوں اُتر کر کاغذ پہ آ گئیں۔ میں حیران ہو جاتی تھی کہ یوں چلتے پھرتے کوئی مصرعہ اب بھی کوئی، واک کرتے ہوئے، رات کو لیٹے ہوئے، سونے سے پہلے، گاڑی چلاتے ہوئے، یہ شاعری کیسے اترتی ہوں۔ ہاں! یہ میں مانتی ہوں آپ اس کو پالش کرتے ہو۔ لیکن میں نے بہت سارے دوستوں کو، سارا اپنا قبیلہ ہے۔ میں نے ان ساروں کے بارے میں میں اتنا ژورڈ نہیں ہو سکتی۔ میں نے صرف اپنی ذات کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر میں نے اپنا محاصرہ بھی کیا ہے، مشاہدہ بھی کیا

ہے،اپنے آپ کو جج بھی کیا ہے،اپنی خوبیاں،اپنی خامیاں تو ہونا تو یہی چاہیئے۔کہ جو اچھا لکھنے والا ہو اسے اچھا ہونا بھی چاہیئے۔اس کو دھوکے باز نہیں ہونا چاہیئے۔اسے جھوٹا نہیں ہونا چاہیئے۔اگر آپ اپنی تحریروں میں اس کا پرچار کر رہے ہیں تو آپکو اس کا عملی مظاہرہ بھی کرنا چاہیے۔بس یہ اپنا اپنا زندگی گزارنے کا انداز ہے۔آپ کو جو ماحول مل جائے۔آپ کا اپنا مزاج ہے۔لیکن اگر انسان کوشش کرے تو انسان خود کو بہتر کر سکتا ہے۔اس میں آپ دیکھیں کہ جہاں پر لڑائی جھگڑے ہیں۔فساد ہیں۔وہ کیوں ہوتے ہیں۔میں تو ہر چیز کو نفسیات کے پہلو سے دیکھ کر کسی کو ذمہ دار بھی نہیں ٹھہراتی۔بہر حال یہ جو تخلیقیت کی دنیا ہے، یہ ایک جائے پناہ ہے۔یہ کونہ ہے جس میں تخلیق کار نے اپنی دنیا بسا رکھی ہوتی ہے۔جس میں کوئی بھی دوسرا شامل نہیں ہوتا۔کسی کا پاس سے لینا دینا نہیں ہے۔یہ تخلیق کار کی اپنا سوچ ہے،اس کا اپنا قلم ہے،اس کی اپنی آنکھیں ہیں،جس میں وہ دنیا دیکھتا ہے۔جہاں تک اس کی پہنچ ہے،وہ وہاں تک اپنے بساط کے مطابق اپنے قلم کی طاقت سے ڈلیور کرتا ہے۔میں نے محنت تو بہت کی ہے۔میں نے اپنی پوری زندگی اپنی تخلیق کاری کو دے ڈالی۔ایک میں اپنے خاوند کو کہتی ہوں کہ میں نے اپنی ساری عمر تمہیں دے دی اور اپنی شاعری کو بھی۔ظاہری بات ہے کہ خاوند سے مراد جو آپ کی فیملی ہے۔ظاہر آپ کے لئے بہت اہم ہے۔میں دیکھوں تو میں نے ساری زندگی اس کے لئے اپنے آپ کو پاگل بنا کر رکھا۔کسی کو نہیں پتہ۔میں کس کس دور سے گزری۔میں نے کس طرح اور کہاں کہاں بیٹھ کر لکھا۔میں نے بچپن میں لکھنا شروع کیا تو میرے ساری گھر والے اسے ناپسند کرتے تھے۔اس پر بہت ہنگامہ ہوا تھا کہ یہ غلط کرتی ہے۔شاعری پتہ نہیں کیا ہوتی ہے۔میری ڈائریاں پھاڑی گئی تھیں۔میری پہلی کتاب میں ایک نظم ہے ڈائری جلا ڈالوں۔جب ہم بیٹھ کر بات کر رہے ہوتے ہیں،کسی بھی پہلو پر تو مجھے لگتا ہے کہ میں نے ہر پہلو پر شاعری کی ہوئی ہے۔تو اب مجھے لگتا ہے کہ میں نے بہت لکھا ہے۔یعنی ایک کتاب بنانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے دس کتابیں پھاڑی ہیں۔

ارژنگ: کوئی بے حد آسودہ وقت ؟تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

رخشندہ نوید: جی آسودگی کے لمحے اور مقامات زندگی میں بہت آئے۔کوئی شک نہیں ہر کتاب چھپنے کے بعد ایسا لگتا تھا،جب تقاریب ہوتی تھیں،جب ان کو سراہا جاتا تھا،یقیناً دل بڑا ہوتا تھا۔جب میری بیٹی نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا تو وہ لمحہ شائد مجھے یاد ہے۔وہ بہت بڑا دن تھا۔

ارژنگ: مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے کیا اس سے مطمئن ہیں؟

رخشندہ نوید: حتیٰ کہ وقت کے ساتھ ہر چیز میں تبدیلی آئی ہے،آرہی ہے تو مشاعرہ بھی اب وہ گاؤ تکیئے،وہ فرشی،وہ پان ان سب سے باہر نکلا ہے۔اس میں سب کچھ بدلا ہے۔شاعری بھی بدلی ہے۔وہ شاعری بھی اب نہیں رہی۔وہ شاعری اس سے مختلف ہے کہ جسے آپ آسودگی کے لئے کسی کونے میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔میر کو پڑھتے ہیں۔آپ ناصر کاظمی کو پڑھ رہے ہیں۔موضوعات مختلف ہو گئے۔مشاعرہ تھوڑا پرفارمنگ آرٹ کی طرف آگیا ہے۔بہر حال جیسے میں نے پہلے بھی کہا کہ شہرت کا معاملہ ہے کہ کون فلپ ہو گیا،کس کے کلام کو پذیرائی ملتی ہے مشاعرے میں۔یہ بھی ایک مکینیکل ہب ہے۔ہمیں گرج نہیں کرنا چاہیے کہ سٹیج پر اس کی جگہ ہم ہوتے،صدارت کی جگہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا۔کیونکہ یہ سارا ایک دور چل رہا ہے،اس کو اسی طرح چلنے دیں۔یہ اسی طرح رہے گا۔اس سے بدتر ہی ہوگا،اس سے بہتر نہیں ہوگا۔اس میں آپ کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ مفاد پرستی کا دور ہے۔مشاعرہ اب ایک بڑا فائدہ مند پروفیشن ہو گیا ہے۔بیرون ملک جا کر مشاعرے پڑھنے سے آپ اتنے امیر ہو جاتے ہیں کہ آپ مکان اور کوٹھیاں بناتے ہیں۔پھر اس میں لیگ پولنگ نہیں ہونی چاہیے۔اس میں عوام سے رشتہ ضروری ہے۔اس کے بغیر ہم لوگ مگر میں تو زیادہ اپنے اندر رہنے والی ہوں۔میرے سب سے بہت اچھے ٹرمز ہیں۔میرے ٹرمز کسی سے بھی خراب نہیں ہیں۔میں نے خود کو گرپنگ میں آنے نہیں دیا۔اس لئے کہ یہاں سب دوست ہیں،کوئی لفٹ یا رائٹ نہیں ہے۔فلاں گدی نشین کے پیچھے ہم نے نہیں چلنا،اگر دیکھا جائے تو میں نے یہ سفر تنہا طے کیا ہے۔اور میں نے پرو وکیا ہے کہ اگر آپ کام کرتے رہیں تو آپ کو پہچان ضرور ملتی ہے۔اب جیسے میں سمجھتی ہوں کہ سب سینیئرز سے سیکھا ہے۔آپ مجھے یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں فلاں گروپ کی ممبر ہوں یا فلاں سے میری دوستی نہیں ہے۔جہاں تک معاملہ رہ گیا مشاعروں میں جانے کا،بلائے جانے کا اب اتنے مشاعرے ہوتے ہیں۔ممکن نہیں ہے کہ ہر ایک میں آپ کو بلایا جائے۔جہاں سے بلاوا آتا ہے،وہاں پہ میں چلی بھی جاتی ہوں۔اگر میں جا سکتی ہوں تو میں چلی بھی جاتی ہوں۔لیکن یہ کہ زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے کرنے کو۔اگر ہم سمجھیں کہ مشاعرہ پڑھنے سے ہی ہم شاعر ہیں،ہماری شاعری قائم ہے۔اس

سے ہی ہماری پہچان ہے۔تو ایسا نہیں ہے۔ہاں کبھی کبھار ذہن میں سوچ آ بھی جاتی ہے کہ اس مشاعرے میں مجھے بلایا جانا چاہیئے تھا۔خیر نہیں بلایا تو چلو کوئی بات نہیں۔لیکن اب کمرشل مشاعرے کا دور ہے۔پرفارمنگ آرٹ کا دور ہے۔آپ جتنا اچھا مضمون لے کر پبلک میں چھوڑیں گے، جیسے ایک پھل جھڑی ہوتی ہے، اس کو آگ لگا دو تو وہ اوپر چلی جاتی ہے، وہ جگمگاتی ہے۔ایک مشاعرے میں کینڈل جل رہی ہے آپ اس کے آگے بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔وہ باتیں اب ختم ہوگئی ہیں۔ظاہر ہے اب اسکو قبول کرنا پڑے گا۔ادب میں یہ بڑی زیادتی ہے کہ کوئی قوانین تو ہیں نہیں، کوئی سرپرست اعلیٰ تو ہے نہیں، جیسے وزیراعظم یا صدر ہے وہ ملک کا نظام چلاتے ہیں۔جو شاعری یا علم و ادب کا میدان ہے اس میں یوں تو ہے نہیں کہ جیسے افتخار عارف کہیں گے ہم وہ کریں گے۔کیونکہ وہ اس وقت سب سے سینئر ہیں۔اور جناب خورشید رضوی صاحب ہمارے قبلہ و کعبہ ہیں۔ان سے بڑا کوئی فارسی دان، عربی دان، دانشور اور علم و ادب والا ہے نہیں۔وہ جو کہیں گے ہم سب اس پر اکتفا کریں گے۔یا جو جناب امجد اسلام امجد صاحب جو کہیں گے، یا فتویٰ دیا کہ یہ جو مشاعرے کا سٹائل چل رہا ہے یہ نہیں ہونا چاہیئے، پرانا ہوگا نیاء ہوگا ایسے چلو تم لوگ۔ایسے کرو تم لوگ۔یہ تو شتر بے مہار ہے۔دبئی مشاعرے کی روایت بن گئی ہے کہ UAE میں ٹکٹ لگا کے مشاعرہ ہوگا۔یا جناب جو بھی مختلف روایات بن رہی ہیں ان کو کوئی روکنے والا نہیں ہے تو بس اسی طرح سے ہے۔

ارژنگ: کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

رخشندہ نوید: لکھنے کی تحریک دونوں طرح سے ہوتی ہے۔ظاہری بات ہے ہر انسان کے اندر بھی ایک دنیا ہوتی ہے۔ایک جہان ہے اور ایک کائنات بھی اسکی نظروں کے سامنے ہے۔تو میرا خیال ہے کہ ایک آنکھ دل کے اندر بھی کھلتی ہیں۔تو میرا خیال ہے کہ آپ کو لکھنے کی تحریک دونوں طرح سے ملتی ہے۔اس دنیا میں بھی ہزار ہا مضامین ہیں، واقعات ہیں، سانحات ہیں تو لکھنے کے لئے تو آپ کیا سے کیا لکھ سکتے ہیں۔پوری دنیا آپ کے سامنے ہے۔بس آپ کا قلم لکھنے پر راضی ہو، آپ کی طبیعت مائل ہو تو تحریک ہی تحریک ہے۔ہاں بس! شاعری جب ہم لکھتے ہیں تو آپ بیتی ہوتی ہے۔میں یہ نہیں کہتی کہ ہم شاعر لوگ اپنی ذات کو کہیں الگ رکھ کر لکھ رہے ہیں۔جب انسانوں کی سیکس ایک ہیں وہی خوشی ہے، وہی ہار جیت ہے، وہی محبت نفرت ہے، وہی تصادم ہے، وہی فساد ہے، وہی مفلسی ہے، وہی لڑائی جھگڑے ہیں تو یہ جو ایک یکسانیت ہے۔تو یہ ضرور ہے کہ جب آپ میں کہتے ہیں۔کونسا میرا ایک شعر ہے، مجھے اکثر رلایا ہے ایک دکھ نے، ابھی جو جان پر جھیلا نہیں تھا۔تو جب آپ میں بھی لکھ رہے ہوتے ہیں تو وہ نہیں ہوتے۔تو وہ میں کو آپ نے کہیں دیکھا ہوتا ہے۔آپ کے کہیں مشاہدے میں، کہیں آپ کے تجربے میں ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے مشاہدے میں بھی یہ بات ہوتی ہے۔تو آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں مکس ہو جاتے ہیں، مین سمجھتی ہوں، جب آپ صرف آپ ہوتے ہیں تو یہ آپ نہیں ہوتے، آپ جیسے بہت سے ہوتے ہیں۔آپ جیسے ہوتے ہیں۔جن کے حالات آپ سے ملتے جلتے ہیں۔جو احساسات محسوس کر سکتے ہیں۔اکثر لوگ شعر سن کر کہتے ہیں کہ لگتا ہے کہ آپ نے مجھ پر لکھا ہے تو وہ کیوں کہتے ہیں تو وہ اسی لیے کہتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے لکھا وہی سرگزشت اس کی بھی تھی۔مطلب یہ کہ جب میں مشاعرہ پڑھ کر گاڑی چلا کر آ رہی ہوتی ہوں تو مصرعوں کی بارش ہو رہی ہوتی ہے۔جب میں گاڑی چلا رہی ہوتی ہوں۔بعض اوقات گاڑی روک کر مجھے موبائل کے نوٹس میں لکھنا پڑتا ہے۔میں واک کر رہی ہوتی ہوں تو بہت شاعری اترتی ہے۔میں پھر لکھ لیتی ہوں میں پھر اس کے علاوہ چلتے پھرتے نظمیں آپ کو سوجھ جاتی ہیں۔کچھ حتمی نہیں ہے یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے کسی بھی وقت آپ لکھ سکتے ہیں۔کسی بھی بات سے متاثر ہو کر آپ لکھ سکتے ہیں کوئی مخصوص ٹائم یا حالات نہیں ہیں۔کبھی آپ کسی سے متاثر ہو کر لکھ رہے ہیں، کبھی آپ کن حالات میں لکھ رہے ہیں یہ تھوڑا سا راز کی بات ہے۔یہ شاعری، یہ لکھنا یہ سب راز کی باتیں ہیں، کشف کی باتیں ہیں۔غیب کی باتیں ہیں۔

ارژنگ: ادب میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

رخشندہ نوید: سوشل میڈیا ادب کوئی بہت زیادہ ٹریننگ تو نہیں کر رہا وہ سوائے اس کے کہ ہر کوئی اسکو اپنی پرسنل پروجیکشن کے لئے استعمال کر رہا ہے۔یوٹیوب پہ بھی ہر کوئی اپنی اپنی چیزیں لگاتا ہے۔ٹھیک ہے اس تک سب کی رسائی ہوگئی ہے۔لیکن میں نہیں سمجھتی کہ سوشل میڈیا آپ دیکھیں اب اتنے ڈھیر سارے چینلز کھل گئے ہیں۔لیکن کسی ایک چینل پر مجھے کسی ایک ادبی پروگرام کا نام بتا دیں۔مطلب میں اپنی بات کروں تو میں نے ٹی وی کے لئے بہت زیادہ کمپئرنگ کی ہے۔جو ایس ٹی این چینل تھا اس کے لئے میں نے ایک پروگرام سہ ماہی تک کیا۔نہ صرف میں اسے لکھتی تھی۔بلکہ ہوسٹ کرتی تھی۔جس کو سید سرفراز شاہ صاحب جو پاکستان کی ایک بہت بڑی

روحانی شخصیت تھے، ہر پروگرام میں وہ میرے سامنے بیٹھے ہوتے تھے۔ ہم مذہبی اور سماجی پہلوؤں پر بات کرتے تھے۔ وہ بھی پرانی بات ہے۔ میرے پاس اس کی ریکارڈنگز موجود ہیں، لیکن میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ وہ پروگرام میں نے ہوسٹ کیا۔ اس کے بعد پی ٹی وی پر مشتاق صوفی صاحب نے ایک ادبی پروگرام وہ پورا سال میں نے ہوسٹ کیا۔ اس کے بھی سوالات میں خود ہی بنایا کرتی تھی۔ اس میں کئی شاعروں سے اور ادیبوں سے ملاقات ہوتی تھی۔ پھر ان کی شاعری گائی بھی جاتی تھی۔ تو میں اس پر بات کر رہی ہوں کہ کسی چینل پر شائد کبھی کوئی ادبی پروگرام چلا ہو۔ محرم میں قصیدے پہ بات ہوگئی۔ عید میلاد النبیؐ پر نعت پہ بات ہوگئی۔ بڑے بڑے مصنفوں سے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ آپ کو کچھ دے رہے ہوتے تھے۔ انٹرویوز دے رہے ہوتے تھے۔ وہ سب ختم ہو گیا ہے۔ یا تو سیاست رہ گئی ہے۔ کسی ایک چینل کو ایک موضوع مل جائے تو سب اسی پر شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی پر وہ سب پاگل ہو جائیں گے سارے۔ اب ادب کی خدمت تو کہیں پر بھی نہیں ہو رہی۔ وہ دور ہی نہیں ہے۔ دل چاہتا ہے میوزک کسی چینل پر لگا ہوا ہو۔ کوئی اچھا میوزک۔ میں نے تو اپنے موبائل میں سودو سو گانے داؤن لوڈ کر لئے ہوئے ہیں۔ وہ میں گاڑی چلاتے وقت بھی سن لیتی ہوں۔ میں تو اب نیٹ فلیکس پہ فلمیں دیکھتی ہوں۔ یا کوئی ایک آدھ پروگرام دیکھ لیتی ہوں۔ ورنہ وہی گھسے ہوئے مضامین لے کر جس میں صرف عورت کو ہی ذلیل کیا جا رہا ہے۔ حقیقت سے بہت زیادہ قریب نہیں ہے۔ یا اس کلاس کو دکھایا جا رہا ہے جو اکثریت میں نہیں ہے۔ دوسرے موضوعات پر کیوں بات نہیں کی جاتی۔ بڑے بڑے مصنفوں کے افسانے ان پر بات ہو سکتی ہے۔ یہ جو ڈرامہ بنایا جا رہا ہے یہ پتہ کیا ہے مطلب ایک قسط آپ کی توجہ حاصل کر بھی لیں تو پھر اس کے بعد وہ اتنا بور نگ ہو جاتا ہے کہ آپ نروس ہو جاتے ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ آپ کوئی فلم دیکھ لیں۔ فلموں پہ تو آج کل پیسے ضائع ہوتے ہیں۔ مجھے اگر کوئی نہ ملے تو میں اکیلی ہی چلی جاتی ہوں۔ کہ میں دیکھ لیتی ہوں۔ لیکن وہ ہٹ ہو جاتی ہے۔ اگر میں نیٹ فلیکس پر کئی انگلش ڈرامہ سیزن دیکھنا چاہوں تو میں وہ سیزن دیکھتی ہوں۔ وہ انہوں نے کمال کے بنائے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ ایک پروڈکشن ہے۔ کچھ بات ہے، سسپنس بھی ہے۔ وہ بھی اس موجود ہے۔ فطرت سے متعلقہ جو ہیں اس پر انہوں نے بہت ری سرچ کی ہے کہ یہ دنیا بنی کیوں ہے۔ پانی کی کیا اہمیت ہے۔ آکسیجن کہاں سے آتی ہے۔ اس پر ڈاکومنٹریز یا فطرت سے متعلقہ جو فلمیں ہوتی ہیں وہ میں شوق سے دیکھتی ہوں۔ خاص کر آج کل دیکھ رہی ہوں۔

ارژنگ: ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

رخشندہ نوید: نیا کام جو میں آج کل کر رہی ہوں اس کا ادراک مجھے ابھی ہوا نہیں ہے۔ میں نے بتایا نہ کہ بس اور ہی طرح کا مزاج ہے میرا کچھ سال پہلے اسلام آباد کی ایک کمپنی نے مجھ سے بچوں کی کہانیاں میری آواز میں ریکارڈ کروائیں۔ وہ تقریباً سو کہانیاں تھیں۔ اس کے لئے کتابوں کا انتخاب میں نے خود کیا۔ وہ اردو کی کہانیاں تھیں مختلف کہانیاں تھیں جنگلوں کی، پریوں کی، کئی سبق آموز، جانوروں کی اس طرح وہ میں نے ریکارڈ کروائیں اور اسلام آباد کے ریڈیو چینل پر چلتی رہیں تو میں تو بھول گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہوا یہ کہ جب میں وہ ریکارڈ کروا رہی تھی۔ تو مجھے بہت خیال آیا کہ یہ میں جو کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ اس میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو بچوں کے لئے سبق آموز ہو۔ ان کو کچھ آج کل کے زمانے کی بات ہو۔ تو پھر میں کہانیاں لینے کے ساتھ ساتھ میں نے خود بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں۔ ان کی تعداد چالیس پچاس ہے۔ وہ ایسے کہ میں پھر ایک ایسے ادارے کے ساتھ بھی کام کر رہی ہوں۔ جہاں پر ہم کہانیوں کو یوٹیلائز کر سکتے ہیں تو پھر وہ ریکارڈنگز میں نے اوپن کیں تو سننے والوں نے کہا کہ یہ تو آپ کا بہت بڑا کام ہے۔ اس کو آپ نے چھپا کے رکھا ہوا ہے۔ اپنی آواز کو بھی اور ان کہانیوں کو بھی۔ تو اب میں ان کہانیوں کو کمپوز بھی کروا رہی ہوں۔ وہ آڈیو میں بھی موجود ہیں اور آج کل میں کچھ نئی بچوں کی کہانیاں بھی لکھ رہی ہوں۔ اگر میں سوچوں کہ میں ان کہانیوں کی کوئی کتاب چھپواؤں تو وہ کہانیاں بچوں کے دکھ سکھ اور اس سے متعلقہ ہیں۔ آخر میں میں آپ کو ایک ایسا پوائنٹ دے دیتی ہوں کہ جو زندگی میں ان کے کام آ سکے۔ نصیحت تو میں نہیں کہہ سکتی۔ مذاق مذاق میں جو ان کی سمجھ میں آ جائے۔ ایسی ہلکی پھلکی سی وہ کہانیاں ہیں۔ ایک تو یہ میں آج کل کام کر رہی ہوں۔ میں پنجابی کہانی بھی لکھ رہی ہوں۔ اردو افسانہ بھی لکھ رہی ہوں۔ اگر میں کوشش کرتی تو میں اس سے بہت زیادہ کام کر سکتی تھی۔ اور میں اس سے بہت زیادہ مشہور ہو سکتی تھی۔ مجھے وہ ٹیکنکس معلوم ہیں جن سے آپ مشہور ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے ایک مزاج کی ضرورت ہوتی ہے لیکن میرے پاس اس مزاج کی کمی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے اللہ کی بہت زیادہ

مشکور ہوں۔ جو مجھے اس سفر میں بہت دور تک لے کر گیا ہے۔ میں مشاعرہ پڑھتے پڑھتے عمرہ تک کر آئی ۔میں اکیلی تین بار امریکہ میں ٹریول بھی کر آئی۔ تو یہ سب شاعری کے بل بوتے پر ہوا ہے۔ اور میں نے خدا سے کیا لینا ہے۔ تھوڑی سی نیک نامی ۔ میں دوستوں کی دوست ہوں۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے دیکھا ہے کہ میں کم سوشل ہوگئی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں جو میری ذات سے منسلک ایکٹیویٹیز ہیں میں ان سے زیادہ ایکٹو ہوگئی ہوں۔ آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ میں دور ہوگئی ہوں مجھے لگتا ہے۔ حالانکہ اب آ کے میرے پاس ٹائم بھی بہت ہے۔ دھیرے دھیرے میں اپنی ذات کے خول میں زیادہ قید ہوگئی ہوں۔ تمام عمر بس عجیب طرح سے کٹ گئی ہے بس فیملی میں بھی یہی ہوا کہ آپ کو اپنے مزاج کے لوگ نہیں ملتے۔ ملتے تو آپ سب سے ہو۔ یہاں پہ آپ اور تو کچھ نہیں کر سکتے۔ بس آپ تھوڑا سا پیچھے ہو جاتے ہو۔ آپ کو لگتا ہے شائد یہاں آپ کی پرسنلٹی کو بھی نقصان ہو سکتا ہے۔ آپ پھر گھر تک قید ہو جاتے ہو۔ آپ واک زیادہ کرتے ہو۔ باغوں میں چلے جاتے ہو۔ آپ پرندوں سے باتیں کرتے ہو۔ میں واک کرنے کی بڑی شوقین ہوں۔ لاہور کا کوئی ایسا پارک نہیں جہاں میں نے واک نہ کی ہو۔ اقبال ٹاؤن میں میرا گھر تھا تو وہاں ایک گھنٹہ واک کرتی تھی۔ اب لوگ اور عجیب طرح کے ہو گئے ہیں۔ دوستوں کی کمی ہوگئی ہے۔ آج کل میں ایک افسانہ لکھ رہی ہوں جب وہ چھپے گا تو پھر اس میں ایک دوست کی تلاش ہے۔ اس میں کہانی یہی ہے کہ وہ دوست ہیں تو بہت ۔لیکن آخر میں کریکٹر کہتا ہے کہ مجھے بوائے فرینڈ کی ضرورت ہے ۔ مجھے عورتوں کی نسبت آدمیوں کی کمپنی زیادت بہتر لگتی ہے۔ اس میں کچھ چیزیں بہتر ہوتی ہیں۔ بہ نسبت آپ کی فی میل کمپنی کے۔ تو دوست بہت ہیں۔ شاعرانہ قبیلے میں بہت دوست ہیں۔ ہر جگہ بہت دوست ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ میں انجوائے نہیں کرتی۔ وہ شاعرانہ بات ہے نا کہ ازلی تنہائی تو ایک کارنر پہ ہے۔ جب آپ اکیلے بیٹھے ہوتے ہو۔ سب کے ہونے کے باوجود۔ اگر شاعر نہ ہوں تو شائد آپ آپ بھی نہ ہوں۔

اگر ہم خواتین کی بات کریں تو مجھے عورت کا یہی روپ بہتر لگتا ہے جس میں وہ ایک خود اعتماد ڈیسنٹ خود کو سنبھالنے والی، ہر حالات میں کسی کی محتاج نہ ہو۔ اور خود کو سمجھنے والی۔ ہمارے بنیادی مسائل میں شائد یہی بات ہے کہ میں نے بھی اپنی شاعری میں میل، فی میل کے طور پر لکھا ہے۔ اور عورتوں سے متعلق لکھا ہے، تو وہ جو خواتین ہیں جو خود کو چھوڑ دیتی ہیں۔ ٹھیک ہے آپ زندگی میں بہت قربانیاں دیتے ہیں۔ آپ اپنے بچوں کے لئے جیتے ہیں۔ اپنا گھر بناتے ہیں۔ سب کچھ ہے۔ گھر کے کام میں گھائل ہو جاتے ہیں آپ۔ لیکن اس میں خود کو بچا کے تھوڑا رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ تو زمانہ تو آپ کے اوپر سے پاؤں رکھ کر آ پکو روند کر گزر جاتا ہے۔ میں کبھی خواتین سے ہاتھ ملاؤں تو مجھے ان کے ہاتھ اتنے کھردرے، اتنے رف لگتے ہیں مجھے۔ مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ وہ عورتیں ہیں جس نے برتن مانجھ مانجھ کر اپنے ہاتھوں کا یہ حال کر لیا ہے۔ برتن ضرور دھوئیں لیکن ہاتھوں میں گلوز پہن لیں۔ یہ سب اپنا خیال کرنے کی بات ہے۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ عورت کو اپنی پرسنلٹی کا خیال رکھنا چاہیئے۔ یہ ہر حال میں ضروری ہے۔ اپنے لئے زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ کبھی کبھار خود کے لئے بھی جینا چاہیئے۔ اپنا بناؤ سنگھار، اپنا لباس، اپنی صحت، سب سے زیادہ ہیلتھ ضروری ہے۔ عورتیں کیا ہیں کہ اتنا وزن بڑھا لیتی ہیں کہ اپنا خیال نہیں کرتیں وہ اس لئے نہیں کرتیں کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ امیری غریبی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس نے آپ کو دنیا بھیج دیا ہے تو آپ اپنا خیال رکھیں۔ اب میں بھی اتنی امیر نہیں ہوں۔ لیکن میں جتنا مجھ سے ہو سکتا ہے۔ لوگوں کی مدد کرتی ہوں۔ میرے گھر کی جو ٹیرس ہے اس کی لین میں ایک سکول ہے ۔ٹیک اے چائلڈ سکول۔ یہ ان عورتوں کے بچوں کے لئے ہے جو ہمارے گھروں میں کام کرتی ہیں۔ یہ بہت ہی اچھا سکول ہے۔ کافی برسوں سے ہے۔ میرا ان میں کافی انٹرسٹ ہوتا ہے۔ جب بھی ان کا سالانہ فنکشن ہوتا ہے۔ تو میں دیکھتی ہوں۔ سائیکلوں پہ بٹھائے ہوئے بچے۔ موٹر بائیکس پر، پیدل انگلیاں پکڑ کر ان کو لے کر جا رہے ہیں۔ لیکن یہ بہت بڑی نیکی کا کام ہے۔ بعض اوقات میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ نوکری چھوڑ کر کسی ایسے ادارے میں کام کروں۔ جہاں سوشل ورک زیادہ ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے کام کرنے کا موقعہ ملے۔ لیکن پھر وہی بات کہ اگر نوکری چھوڑ دی یہ والی تو پھر میرے گھر کا کرایہ کون دے گا۔ لیکن فی الحال میں اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ میں یہ نوکری چھوڑوں۔ پھر ہمارے قریب ہی ایک ہسپتال بنا ہوا ہے۔ المصطفیٰ ہاسپٹل وہاں میں اتفاق سے ایک بار چلی گئی۔ میں وہاں سے اتنی متاثر ہوئی کہ میں اپنا علاج کرانے کے لئے وہاں چلی جاتی ہوں۔ لیکن وہ جو پیسے تین ہزار یا چار ہزار جو میں نے کسی سپیشلسٹ کو دینے ہیں وہ میں انکو

چیرٹی کر آتی ہوں۔ وہاں لوگوں کو پچاس روپے کی پرچی بنا کر بہت ہی اچھا علاج مل رہا ہے۔ وہ اپنی پبلسٹی بھی نہیں کرتے۔ اس کے جو آنرز ہیں وہ فوج کے کچھ ریٹائرڈ افسرز ہیں۔ میری ان سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی ہے۔ اور میں ان سے کہتی ہوں کہ شائد اتنے اچھے انتظامات لاہور کے باقی ہسپتالوں میں بھی نہیں ہیں۔ جوان غریب لوگوں کو وہاں مل رہے ہیں۔ ڈاکٹرز بیٹھے ہوئے ہیں وہاں۔ ہر شعبے کے ڈاکٹرز، کیا آنکھوں کے، کیا گردوں کے، کیا دل کے۔ لیبارٹری، ہر چیز۔ کبھی میرا وہاں بھی دل کام کرنے کو چاہتا ہے۔ دل کرتا ہے کہ میں اپنا ٹائم ان کو دے دوں۔ وہاں جا کر بیٹھ جاؤں۔ کسی طرح ان کی ہیلپ کروں۔ دل تو چاہتا ہے کہ کوئی ایسا کام کیا جائے جو انسانیت کے لئے ہو۔ جو غریب قوم کے لئے ہو۔ میں فائدہ مند ثابت ہو جاؤں کسی کے لئے۔ شاعری کرنا، رائٹرز بننا یہ بہت خاص کام ہے یہ ہر کوئی نہیں کرتا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں، بہت اہم لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی معاشرے میں بہت اہمیت ہے۔ اگر یہ چاہیں تو کچھ ایسا بھی لکھ سکتے ہیں جس سے انقلاب آ جائے۔ ہماری تاریخ میں موجود ہیں ایسی مثالیں۔ بہر حال میں کچھ ایسا نہیں لکھ سکی کہ جس سے میں سمجھوں کہ تبدیلی آ جائے گی۔ جس کو پڑھ کر کوئی سبق آموز ہو جائے گا۔ یہ تو عطاء ہے جو آپکو سوجھتا ہے وہی آپ لکھتے ہیں۔ لیکن اب بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں کچھ ایسا لکھوں کہ جو اس سے بھی زیادہ فائدہ مند ہو۔

ارژنگ: کیا کھویا کیا پایا؟

رخشندہ نوید: جی ہمارے بچوں میں بیٹیاں ہیں۔ بیٹا نہیں ہے۔ تو میرا مطلب ہے کہ لوگ شائد اس پر یقین نہ کرتے ہوں۔ لیکن مجھے تو آج تک احساس نہیں ہوا کہ کچھ کمی ہے۔ اور میری بیٹیاں میرے جیسی ہیں۔ بچپن سے ہی میں نے ان کو ٹرانسلیشن پہ لگایا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میں ان کو اخبار دے دیا کرتی تھی انگریزی کا کہ آپ اس پیراگراف کو اردو میں ترجمہ کرو۔ یا پھر وہ ایچ ای سن سکول سے وہ پڑھی ہیں اس کے بالکل پیچھے پبلک لائبریری تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان کو چھوڑنے اور لینے خود جاتی تھی۔ تو میں نے ان کو اس لائبریری کی ممبرشپ لے دی تھی۔ وہ اپنی پسند کی کتابیں وہاں سے چنتی تھیں۔ ناولز وغیرہ، سائنس فکشن جو ان کی چوائس ہوتی تھی۔ بعد میں میں انہیں گائید بھی کرتی رہی۔ وہ بہت پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں۔ وہ سب جاب بھی کر رہی ہیں۔ ان میں بھی میرے والا کیڑا آ گیا۔ اور بہت چھوٹی عمر میں اپنے بیلنس، اپنے اے ٹی ایم انجوائے کرتی ہیں۔ اور ان کی شادیاں بھی اچھے گھرانوں کے لڑکوں کے ساتھ ہوگئی ہیں۔ کچھ معاملوں میں اللہ نے میرے لیے بہت سی آسانیاں بھی رکھیں۔ میں اس کے لئے اس کا ایک دن میں ایک لاکھ مرتبہ شکر ادا کرتی ہوں۔ اور مزے کی بات ہے کہ میری کتابوں میں ایک میں کہیں فیملی کا ذکر ہے۔ ایک تو میری ماں کا ذکر آتا ہے۔ میں نے اپنی ماں جی کے لئے ارادۃً نہیں۔ شعر لکھے گئے۔ جیسے وہ میرا ایک شعر ہے

در و دیوار سے جالا نہیں جاتا اماں
مجھ سے گھر بار سنبھالا نہیں جاتا اماں

یہ پوری غزل ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ غزل اور یہ شعر میرا تعارف بنی پوری دنیا میں۔ میں انڈیا گئی تو جب میں نے یہ شعر سنایا تو لوگوں نے کہا کہ یہ آپ کا شعر ہے۔ یہ تو ہم تک پہنچ چکا تھا۔ اسی طرح یہ شعر یو ایس اے میں بھی پہنچا۔ اور میرا تعارف بنا۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی فیملی کے لئے یہ تو ٹوٹل آمد ہوتی ہے۔۔ میں نے کچھ نظمیں ان کے لئے بھی لکھیں۔ بیٹی کے لئے۔ اس کے بے بی کے لئے پھر حالیہ اپنی بیٹیوں کے جو لائف پارٹنرز ہیں ان کے لئے بھی لکھا۔ میرا خیال ہے کہ شائد کبھی کسی نے لکھا ہے۔ لیکن ایک نظم ان کے لئے بھی مجھ سے لکھی گئی۔ ہو سکتا ہے میں کسی کتاب میں اس کو شامل بھی کروں۔ سو آپ کی لائف آپ کی فیملی، آپ کے رشتے شاعر ہونے سے، مصنف ہونے سے وہ کم تو نہیں ہو جاتے۔ مطلب میں بہت زیادہ فیملی والی، ہر چیز میں چھوڑ سکتی ہوں یا چھوڑ دیتی ہوں جب اپنی فیملی میں ہوتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ میں مصنف ہوں۔ ان کو کبھی میں نے احساس نہیں ہونے دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرا شروع سے ہی یہی سٹائل رہا ہے۔ ایک شاعرانہ تو ہے۔ اس سے کوئی دنیا کا شخص انکار نہیں کر سکتا۔ میں خود کو جھٹلا نہیں سکتی۔ ہاں لیکن ایسا نہیں ہے کہ میری فیملی بیٹھی ہو اور میں ایک کونے میں جا کر ٹیبل پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگوں۔ میں نے یہ رواج خود کو نہیں دیا۔ خود کو کنٹرول کیا۔ بس یہ جو میں نے جو لکھا ہے کہیں چلتے پھرتے لکھا ہے۔ کہیں مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کونسا ٹائم ہوتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اب آ کر میں نے آرگنائز کرنا شروع کر دیا ہے، یہ فائل میری اس میں بچوں کی کہانیاں ہیں۔ میں نے پنجابی گیت جمع کئے ہوئے ہیں، اب میں ان کو سنبھالنے لگی ہوں۔ تھوڑا بہت کمپوز کروا رہی ہوں، جیسے بہت ساری تقاریب میں میرے رائٹرز نے مضامین

لکھے۔ پھر میرے صحافتی کام ہیں۔ان کی ایک فائل ان کی تصاویر،ان کی گفتگو شامل ہیں۔

یہ جو چیپٹر ہے بڑاافسوس ناک ہے آپ کہہ لیں رائٹرز کی انسلٹنگ ہے کہ آپ کیا کریں۔جب آپ لکھتے ہیں تو دل تو چاہتا ہے کہ اسکو کتاب کی شکل میں جمع کیا جائے۔بس پبلشرز تو یہی کہتے ہیں کہ آپکی کتاب بکتی نہیں ہیں۔شاعری تو کوئی پڑھتا نہیں ہے۔شاعری کی طرف تو ریڈر آتا ہی نہیں ہے۔میں نے تنگ آکر اس پر نظم بھی لکھی تھی۔میری تمام کتابوں کے نام میں بتا دوں۔پھر مثال کیسے ہو،کسی اور سے محبت،غبار اترے پار،خامشی کو سن رہی تھی۔اور وہ جو انتخاب ہے،اسے ہم چھو نہیں سکتے،اور وہ جو ویلنٹائن ڈے والی کتاب میں نے مرتب کی۔کوچہء جاناں اس کا نام ہے۔اور پنجابی کتاب حالی آنہ بسم ہی۔لیکن یہ کہ کتابوں کے ایڈیشن ختم ہو جاتے ہیں۔آپ خود سے چھاپیں۔آپ پیسا خرچ کریں۔سمجھ نہیں آتی کہ آپ کیا کرو۔کوئی ادارہ تو ہونا چاہیے۔اگر کوئی معیار بنا لیں۔کہ اس کتاب کو سٹالز پر ہونا چاہیے اب یہ کس کی ذمہ داری ہے اب میں ڈور ٹو ڈور اپنی کتابیں سٹالز پر رکھوں کہ یہ اچھی شاعری ہے اس کو پڑھ لو۔اس کو خرید لو۔سٹالز پہ رکھ لو۔یہ سارے مسائل ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ضرور ہیں۔اب سب نے کہنا شروع کر دیا ہے آپ نثر لکھیں وہ بکے گی۔نثر لکھیں وہ سٹالز پہ چلے گی۔تو شاعری تو کیا بابا مشکل کام ہے۔زیادہ اہم کام ہے۔میرا مطلب ہے کہ نثر نگار تو بن سکتا ہے لیکن شاعر تو ہر کوئی نہیں بن سکتا۔ہاں جیسے اب ٹرینڈ ہو گیا ہے کہ آپ لکھاری نہیں ہیں مگر آپ کو مشہور ہونے کا شوق ہوا ہے تو چلو کسی سے خرید لیتے ہیں شاعری۔یا کسی سے اپنے نام کی پوری کتاب لکھوا لیتے ہیں۔اپنے نام سے پھر وہ چل جاتے ہیں۔اور ایسے واقعات سننے میں بھی آتے ہیں،دیکھنے میں بھی آتے ہیں۔میں نہیں جانتی کہ اس میں کتنی حقیقت ہے۔جو سکینڈلز بنتے ہیں۔ان کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہوتا ہو گا۔خواتین رائٹرز کے ساتھ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔لکھ کر دینے والے کہ منہ سے نکل جاتا ہے کہ یہ کتاب تو پوری کی پوری میں نے اسکو لکھ کر دی تھی۔اب اگلی کتاب لکھ کر دکھائے تو پھر ہم مانیں گے۔یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ٹرمز خراب ہو جاتے ہیں۔پھر شہر لاہور کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔کچھ شاعرات کو بھی آپ کہہ لیں،سر پہ اٹھاتے،سر پہ بٹھاتے،جو دولت مند ہوتے ہیں۔ان خواتین میں بیرون ملک کے کچھ نام ہیں۔سننے میں آیا ہے۔آئی ایم ناٹ شور کہ ان میں حقیقت کیا ہے۔پہلے خود شہر لاہور نے ان کو تخت پہ بٹھایا۔اور پھر خود گرایا۔اب یہ واقعات بڑے عجیب سے ہیں۔بہر حال میں نے تھوڑا احتیاط سے قدم رکھا کہ بہت زیادہ سکینڈلز میں نہ آؤں کسی بھی قسم کے۔مطلب دوستی سب سے رکھی،سب سے میل ملاپ رکھا۔اٹھنا بیٹھنا سب کے بیچ میں ہے۔میں نے تو پہلے کہا کہ مجھے میلز کی کمپنی فی میلز کی نسبت اچھی لگتی ہے۔لیکن ظاہر ہے کچھ بھی کر لوں،میل سے دوستی کو پسند نہیں کیا جاتا۔اس کو غلط نام دیا جاتا ہے۔حتیٰ کہ جو ہمارے مرد حضرات ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی نے ہنس کر بات کر لی تو وہ ہم پر فدا ہو گئی۔یہ تمام مسائل تو ہیں لیکن ان میں کافی حد تک بہتری آگئی ہے۔کو ایجوکیشن کا دور ہے یہ۔تمام دفاتر میں کوئی اتنا فرق نہیں رہا۔لیکن میں نے کوشش کی کہ کچھ ایسی بھی میرے ساتھ منسوب نہ ہو۔مطلب یہ کہ آپ بھی عزت دار ہوتے ہیں۔اچھے خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔لیکن یہ میرے والدین اور دوسرے آپ بھی عزت دار لوگ ہیں۔ایک تو آپ کی ٹریننگ خود سے بھی ہوئی ہوتی ہے۔پھر آپ اس کو پریکٹس بھی کرتے ہیں۔سوسائٹی میں بھی آپ نے موو کیسے کرنا ہے۔آپ نے اپنا مقام کیسے بنانا ہے۔میرا نہیں خیال کہ آج میں کسی بڑی سرکاری نوکری پہ ہوتی۔اگر میں بھی ایجوکیشن کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی لیفٹ ہوتی تو۔میں اگر تھوڑی سی فرینک ہوتی تو کچھ چیزیں اپنے مزاج سے تھوڑی ہٹ کر کریں تو آپ یقیناً بہت کچھ کر سکتے ہیں۔لیکن میں نے اسکو کبھی آؤٹ نہیں کیا۔نہ کبھی مشاعرے میں جانے کے لئے کیا۔نہ کبھی سرکاری نوکری کے لئے کیا۔بس اگر کچھ نہیں ملا تو کوئی بات نہیں۔آپ وگرنہ مطمئن تو ہیں نا۔کہ آپ نے اپنے مزاج سے ہٹ کر کچھ نہیں کیا۔اچھا سفر کٹ گیا ہے۔اتنا برا نہیں ہے۔ٹھیک ہے سب ٹھیک ہے۔اور شکر تو کرنا چاہیے کہ جو آپ کو ملا ہے،پہلے وہ آپ دیکھ لیں۔جو نہیں ملا اس کو بعد میں دیکھیں گے۔جو آپ کو زندگی نے دیا ہے،آپ اور کیا چاہیں گے۔اپنی فیملی کے ساتھ رہ رہے ہیں۔جب کوئی آپ کا نام لیتا ہے تو وہ اچھے لفظوں میں لیتا ہے۔بس کافی ہے۔اتنا ہی کافی ہے۔

انٹرویو: حسنین سحرؔ

اپنی ابتدائی زندگی اور خاندانی پس منظر سے متعلق کچھ بتائیں۔

ابتدائی زندگی پاکستان کے مختلف شہروں میں گھومتے گزری کہ والد صاحب پاک فوج سے وابستہ تھے۔ 1985 میں والد صاحب نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی جس کے بعد لاہور میں قیام مستقل ہو گیا۔ میٹرک لاہور سے ہی کیا جس کے بعد گورنمنٹ کالج اور ہیلی کالج سے ہوتے ہوئے فرگوسن سے چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا امتحان پاس کیا۔ خاندانی پس منظر کچھ یوں ہے کہ قوم قانوں گو شیخ ہے جس کی رو سے برادری علامہ اقبال سے ملتی ہے، علامہ کے دوست سر عبدالقادر میرے والد کے نانا تھے۔ دادا مرحوم محمد حسین عالمگیر ایڈووکیٹ تھے اور بعد ازاں لکھنے پڑھنے سے وابستہ رہے؛ خاص طور پر قرآن کی تفسیر پر ان کا کافی کام موجود ہے۔ ان کے مخطوطے برادرم شاہد مالکی نے مدون کیے ہیں جو کہ عنقریب "گلدستہ انوار" کے نام سے شائع ہوں گے انشاءاللہ۔

ادب کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

کچھ تو خون نے شروع ہی سے زور مار رکھا تھا، پھر بچپن میں نانا مرحوم شیخ محمد سعید کے ساتھ بہت وقت گزرا جو اقبال کے حافظ تھے۔ ان کی شام ایک گھنٹہ چہل قدمی کی عادت تھی جس دوران وہ اقبال و غالب کے شعر سناتے رہتے۔ اس ایک گھنٹے میں میں ادب کی دنیا میں مسحور رہتا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے معلوم ہوتا چلا گیا کہ یہی میری دنیا ہے۔

آپ کا نظریہ شعر کیا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ ایک جینوئین تخلیق کار صرف تخلیق کرتا ہے اور اس کے نظریات اخذ کرنا نقادوں کا کام ہے۔ ہاں ایک نکتہ نظر ہر شاعر رکھتا ہے جو بس اسی کے لئے مختص ہوتا ہے۔ میرا نکتہ نظر شعر کے متعلق یہ ہے کہ جب تک خیال اور فن کا ایک توازن قائم نہیں ہوگا ایک بامعنی شعر ظہور پزیر نہیں ہو سکتا۔ یہ توازن ایک جمال میں ڈھل جاتا ہے جس کے بغیر شاعری یا کوئی بھی تخلیق اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتی؛ اور شاعری کا مقصد یہ ہے کہ خیال قاری کی زندگی میں کوئی نہ کوئی قلبی تبدیلی پیدا کرے یا ایسی تبدیلی میں اپنا حصہ ڈالے۔ خیال کو سجانا سنوارنا ضروری ہوتا ہے تا کہ اس کا جمالیاتی زاویہ قائم رہے اور واردات کا رشتہ قلبی کیفیات سے استوار رہے۔ یوں شاعری ایک محنت طلب کام ہے جس کے فنی محاسب پر ریاضت قائم رکھنا از حد ضروری ہے۔

جہاں تک خیال کا تعلق ہے یہ بہر حال ایک داخلی تجربہ ہوتا ہے، بھلے کسی خارجی حوالے سے داخل میں وارد ہو جائے۔ خیال یا تو تخلیقیت کے پراسرار نظام کے تحت شاعر پر از خود منکشف ہوتا ہے یا کسی معاملے پر غور و فکر کرنے سے بھی کھل سکتا ہے۔ بہر حال ہر شاعر کے لئے اپنا ایک نظام فکر قائم کرنا ضروری ہے۔

آپ ادبی دنیا میں اس طرح متحرک نظر نہیں آتے جس طرح دیگر شعرائے کرام۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ ادب کی دنیا ہی میری دنیا ہے؛ مگر میں اسے اپنی داخلی دنیا سمجھتا ہوں۔ دوسرا یہ کہ میری کوشش ہوتی ہے کہ وہاں جاؤں جہاں کچھ سیکھنے کو ملے۔ میرا اندازہ ہے کہ آج کل ادبی حلقوں میں زیادہ تر لوگ سکھانے جاتے ہیں سیکھنے نہیں۔ سیکھنے سکھانے کے عمل میں سفر طالب علم ہی کے حصے میں آنا چاہیے اور جو سکھانے کے لئے سفر کرے اس میں کم سے کم میں تو کوئی جوہر نہیں پاتا۔ ڈائلاگ کا زمانہ نہیں رہا اور ہر کوئی اپنی کہنے کے بعد کان لپیٹ لیتا ہے۔ لہٰذا کوشش ہوتی ہے کہ وہاں جایا جائے جہاں کچھ کسبِ علم کا امکان موجود ہو۔ باقی یہ ہے کہ جو محبت سے بلاتا ہے وہاں ضرور جانے کی کوشش کرتا ہوں۔

تخلیق کو پرکھنے کے لئے تنقید کتنی ضروری ہے؟

حضور جس کام کا بھی کوئی واضح مقصد ہو وہ کسی نہ کسی سطح پر ضروری ہوتا ہی ہے؛ اور پھر تنقید تو تخلیق کی شرح کرتی ہے۔ ہر چند کہ شاعری بنیادی طور پر ایک تفریحی انداز میں قاری کی غیر محسوس تربیت کرتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے ہم عینیت یعنی آبجیکٹیوٹی سے مبرا قرار دے دیں۔ ہر تخلیق کا عینی مطالعہ ضروری ہوتا ہے اور نقاد یہی کام سرانجام دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تخلیقی لمحات شعوری رو سے بالا ہوتے ہیں اس لئے ان لمحات میں کی گئی بات کو بعد ازاں تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہوتا ہے کہ رد و قبول کا معاملہ طے کیا جا سکے۔

کیا جدید غزل واقعی یکسانیت کا شکار ہے؟

آپ کا یہ سوال مجھے اپنے شعری نکتہ نظر پر اعتماد کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ دیکھیے! آجکل تواتر سے ایسے شعر منظر عام پر آ رہے ہیں جو آپ کو لمحاتی طور پر چونکا کر کسی اندھیرے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ خیال کی سطح پر دیکھیں تو حضرت غالب کے بعد ایسے ایسے موضوعات غزل میں سما سکتے ہیں کہ اس تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں یکسانیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو پھر اس سوال کا جواز کیا ہے؟ وہ یہ کہ اتنے متنوع اور جدید خیالات کی موجودگی میں شاعری کے فنی نظام کو پچھلی نشستوں پر دھکیل دیا گیا ہے۔ شعر میں ندرت فنی پختگی سے پیدا ہوتی ہے، جسے سیف

صاحب نے انداز بیاں کہا ہے۔ اگر ہر کھانے میں ایک ہی طرح کے مصالحے استعمال کیے جائیں گے تو ہر کھانا مختلف ہوتے ہوئے بھی یکسانیت کا شکار نظر آئے گا۔ بس یہی جدید غزل کے ساتھ ہو رہا ہے، ایک اچھوتا خیال گمان سے گزرا اور اسے جوں کا توں شعری قالب میں ڈھال دیا گیا۔ یہی خیالات اگر ریاضت کی دھیمی آنچ پر پکائے جائیں تو جدید غزل میں یکسانیت نام کو نہ رہے گی۔

آپ کے نزدیک بڑا شاعر کون ہے؟

میرا ذہن اس معاملے میں بہت صاف ہے۔ بڑا شاعر وہ ہے جو اپنے اندر کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔ غبارے پر اگر اندر سے دباؤ ڈالا جائے تو وہ بڑا ہو جاتا ہے اور اگر باہر سے دباؤ ڈالا جائے تو چھوٹا۔ میرے نزدیک بڑا شاعر اس امر سے مبرا ہوتا ہے کہ اس کے کلام کو شہرت مل رہی ہے یا نہیں؛ اسے قبولیت عام حاصل ہے یا نہیں؛ اسے بڑا شاعر مانا جا رہا ہے یا نہیں۔ یہ پہلی کسوٹی ہے۔ دوسری یہ کہ بڑا شاعر بالآخر شعرا، نقاد اور عوام تینوں عدالتوں میں دوام حاصل کرتا ہے۔ چاہے اپنی زندگی میں یا کسی اور زمانے میں۔

آپ نے انگریزی میں تنقیدی مضامین سہولت کے پیش نظر لکھے یا حادثاتی طور پر اس کا آغاز ہوا؟

جی بنیادی طور پر سہولت کے پیش نظر۔ میں کوئی باقاعدہ نقاد نہیں ہوں اور اوپر سے اردو تنقید پر شروع میں اتنی نظر بھی نہ تھی۔ انگریزی تنقید پڑھ رکھی تھی اور کئی تکنیکی اصطلاحات انگریزی میں سہولت سے مل جاتی تھیں۔ پھر اس کا ایک فائدہ بھی نظر آیا کہ جو لوگ اردو شاعری سے دور ہیں وہ شاید انگریزی مضامین پڑھ کر اردو شاعری کے مزاج کو بہتر سمجھ پائیں۔ کچھ اپنی اردو نثر پر اعتماد بھی کم تھا۔ بہر حال اب تنقید اردو میں ہی لکھتا ہوں لیکن اگر کہیں سے فرمائش ہو تو انگریزی میں لکھ لیتا ہوں۔

پہلے شعری مجموعے کے بعد پندرہ سال کا وقفہ اس کی کوئی خاص وجہ؟ دوسرا شعری مجموعہ کب تک متوقع ہے؟

دراصل میرا اصل شعری سفر تو پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد شروع ہوا جب عباس تابش صاحب اور بعد ازاں خالد احمد صاحب کی رہنمائی میسر آئی۔ اسی رو میں (اس وقت) نوجوان دوستوں سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ شاعری اصل میں ہوتی کیا ہے۔ پھر پندرہ سال سیکھنے میں گزار دیے اور جب اساتذہ اور دوستوں نے ہمت بڑھائی تو دوسرا شعری مجموعہ "کارِ دل تمام" 2008 میں شائع کروایا۔

اگلے شعری مجموعے کا مستقبل میں نے ایک کمزور لمحے میں داؤ پر لگا دیا۔ برادرم کنور امتیاز احمد کو ان کی کاہلی سے باہر نکالنے کو ان سے اور خود سے، نجیب احمد صاحب کے سامنے، وعدہ کر لیا کہ جب تک امتیاز صاحب اپنا مجموعہ ترتیب دے کر چھپوا نہ لیں گے تب تک میں اپنا شعری مجموعہ شائع نہیں کرواؤں گا۔ آپ بھی امتیاز صاحب کے دوست ہیں ہماری سفارش کر دیجیے۔

ہماری تنقید مغرب کے تنقیدی نظریات پر کھڑی ہے۔ کیا مختلف کلچر ہونے کے سبب ہم مغرب کے نظریات کو اپنی تخلیقات پر منطبق کر سکتے ہیں؟

جی صرف تنقید ہی نہیں بلکہ ہمارا معاشی نظام، تکنیکی نظام، تعلیمی نظام، طبی نظام اور پورا انفراسٹرکچر مغربی نظریات پر کھڑا ہے۔ اور اس میں کوئی پریشانی کی بات نہیں کیونکہ پہیے کو بار دگر ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دراصل مغربی تنقید نے اپنا دامن اس قدر وسیع کر رکھا ہے کہ ہمارا تخلیقی نظام اس میں سہولت سے اپنی شرح کروا سکتا ہے۔ پریشانی تب ہوتی جب ہماری تخلیقی نظام مغرب کے زیر اثر آ جاتا لیکن الحمدللہ ایسا نہیں ہے۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ تاوقتیکہ ہمارا تخلیقی نظام اس نہج کو پہنچ جائے کہ ہمیں طبعی طور پر اپنے تنقیدی پیمانے مرتب کرنے پڑ جائیں، مغربی تنقید سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

کچھ خالد احمد کے بارے؟

آہ! خالد احمد کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ مافوق الفطرت خصوصیات کے حامل تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک فردِ واحد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ تمام زندگی خالد صاحب کے قدموں میں گزار دے اور ان سے سب کچھ سیکھ لے۔ فردِ واحد کو چھوڑیے، اگر ایک پوری جماعت بھی ان سے کسب فیض کرنے کو اکٹھی ہو جائے تو خالد احمد کا انفرادی علم پوری جماعت کے اجتماعی علم سے زیادہ ہوگا۔ میں تو آج بھی اگر کسی شعری یا ذاتی مسئلے میں گرفتار ہوتا ہوں تو خودکار نظام کے تحت خالد احمد سے رجوع کرتا ہوں؛ اور پھر اپنی روحانی بے بضاعتی پر ماتم کرتا ہوں کہ آپ تک رسائی اب میری پہنچ سے باہر ہے۔ اور کیا کہوں؛ خالد احمد کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں صرف نم ہے جو عطا بھی انہی کی ہے۔ کبھی عالم بالا میں ان سے ملاقات ہوئی تو یہ شکوہ ضرور کروں گا کہ خالد صاحب آپ نے حرف کے حوالے سے ہمیں اتنا کچھ سکھایا، یہ بھی سکھاتے جاتے کہ آپ کے بعد کوئی ہم سے آپ کے بارے میں پوچھے تو اظہار کا قرینہ کیا ہونا چاہیے۔

کیا آپ ادب میں گروپ بندی کے حامی ہیں؟ کیونکہ بظاہر آپ خالد احمد اور بیاض گروپ سے وابستہ ہیں۔

جی پہلے تو گروپ بندی کی تعریف بتا دیجیے۔ اگر تو گروپ ایک ہی شعری نکتہ نظر رکھنے والے افراد کے اکٹھا رہنے کا نام ہے تو میں ضرور گروپ بندی کا قائل ہوں کیونکہ اس کے علاوہ چارہ ہی کوئی نہیں۔ لیکن اگر گروپ بندی اپنے نظریات کو دوسروں پر ٹھونسنے یا دوسروں کے نظریات کو رد کرنے کے لئے سیاست یا بدمعاشی کرنے کا نام ہے تو میں اس کا قطعی قائل نہیں۔ جسے آپ نے خالد احمد گروپ کہا ہے اس کے ممبران پر نظر ڈالیں تو ان کے شعری نکتہ نظر میں مماثلت پائیں گے؛

میری اس باصطلاح گروپ سے وابستگی کا یہی سبب ہے۔ مگر میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ تمام نظریات قابل احترام ہوتے ہیں اور اگر کسی نظریے سے آپ متفق نہیں تو تمیز کا دامن تھام کر دلیل سے بات کرنی چاہیے۔

کتاب اور ادبی رسائل کا مستقبل کیا ہے؟

ارے بھائی یہی سوال تو میں بھی ہر ایک سے کرتا رہتا ہوں۔ دل کی پوچھیں تو مخدوش ہی نظر آتا ہے مگر میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ بہر حال فی الوقت تو میں اسے ہٹ دھرمی ہی کہوں گا۔ شاید آنے والی نسلوں کے لئے یہ اتنا بڑا المیہ نہ رہے جتنا ہمیں نظر آتا ہے۔ کتاب بنیادی طور پر ہمارا رومانس ہے ورنہ اصل بات تو ادبی جوہر کو قائم رکھنا ہے۔ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں مرتے دم تک کتاب کے مستقبل کے لئے لڑوں گا؛ اپنی سکت کے مطابق۔

کیا آپ اپنے تئیں کسی شعر میں خیال کی وسعت پیدا کر کے نیا شعر لکھنے کو سرقہ سمجھتے ہیں؟

دیکھیے! شعر کا جواز کیا ہے؟ یا تو وہ کوئی نیا قضیہ یعنی تھیسس پیش کرے، یا کسی مقبول قضیے کا تضاد یعنی اینٹی تھیسس پیش کرے اور یا کسی قضیے یا تضاد کی تلفیق یعنی سنتھسس سامنے لائے۔ ہر چند کہ بڑے شاعر اپنے پیش کردہ قضیہ یا تضاد کے بل پر ہی تاسیس پاتے ہیں مگر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے پاس بھی ایسے اشعار 50 فیصد سے زاید نہیں دیکھے گئے؛ یہاں تک کہ اقبال نے بھی کہا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہو سکتیں۔ شاعری کا کام تسلسل کے ساتھ تلفیق کی بنیاد پر ہی ممکن ہے۔ اسی تلفیق کو آپ چاہیں تو سرقہ کہہ لیں۔ دوسرے یہ کہ شعری تشویق کہیں سے بھی ظہور پزیر ہو سکتی ہے۔ بعض دفعہ کوئی شعر آپ کو انسپائر کر جاتا ہے اور آپ ایک نئے انداز سے اس شعر کی تلفیق پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسے بھی آپ چاہیں تو سرقہ کہہ لیں۔

کہنے سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی شعر کو سرقہ کہنے سے قبل شاعر کی نیت پر کوئی دلیل پیش کرنا ہوگی۔ اگر کسی بھی شعر کے پیچھے اصالت کارفرما ہوگی تو وہ سرقہ نہ ہوگا۔ ہاں اگر شعر کہنے کے لئے مختلف اشعار پر اس لئے نظر رکھی جائے کہ ان سے شعر نکالیں جائیں تو یہ جائز نہیں۔ شاعر کو ہمیشہ اپنی بات کرنی چاہیے۔

آپ کا یہ سوال بہت اہم ہے اور میں اس کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ غزل کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ اولا ایک خیال نمودار ہوتا ہے اور اسے آپ اپنے طریقے سے کہہ کر ایک زمین متعین کر لیتے ہیں۔ باقی اشعار اسی زمین کی تنکنا میں غور و فکر کر کے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ میری ایک غزل تھی جس کی ردیف "ہے بھی اور نہیں بھی" تھی اور قافیہ آسان، امکان وغیرہ تھے۔ اس میں نادان قافیہ ذہن میں آیا اور نادان کا ایک سامنے کا تلازمہ دل ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے مصرعہ یوں موزوں ہوا کہ "دلِ نادان ہے بھی اور نہیں بھی"۔ ہوتے ہوتے شعر یوں ہوا:

عجب ہے دل کی سینے سے شرارت
یہاں نادان ہے بھی اور نہیں بھی

کافی دیر بعد اساتذہ میں سے ایک شاعر (نام اس وقت ذہن میں نہیں) کا یہ شعر مطالعہ سے گزرا

پہلو میں دلِ تپاں نہیں ہے
ہر چند کہ یاں ہے یاں نہیں ہے

یار لوگ اگر میرے اس شعر کو سرقہ کہیں تو میرے پاس اعتراض کی گنجائش تو نہ ہوگی مگر میرا دل بہر حال مطمئن رہے گا۔ ریکارڈ کی درستی کے لئے یہ عرض کر دوں کہ آج تک کسی نے اس شعر کے حوالے سے یہ گفتگو کی نہیں (اور نہ ہی میرے علم کے مطابق مجھ پر کبھی سرقے کا الزام لگا ہے) لیکن آپ کے سوال سے یہ بات ذہن میں آگئی کہ میں نے کافی دیر اس شعر کو ترک کرنے کے بارے میں سوچ بچار کی تھی اور بالآخر مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں اسے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ بات کو سمیٹتے ہوئے یہی کہوں گا کہ اگر کوئی شاعر اپنے تئیں قضیہ یا تضاد پیش کرتا ہے تو اسے تلفیق کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔

شاعری اور سوشل میڈیا سے آپ کی دلچسپی کہاں تک ہے؟

بہت محدود۔ لیکن میں یہ دلچسپی بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ شاید مستقبل میں ریکارڈ یہیں سے مہیا ہو۔ لیکن میں سوشل میڈیا کو ذات کی تشہیر کے لئے استعمال کرنے کا شدید مخالف ہوں کیونکہ اس میں کئی کو مپرومائز کرنا پڑتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی زندگی بنیادی طور پر جعلی ہے اور اس میں اصالت پر قائم رہنا جہاد سے کم نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سوشل میڈیا پر شاعری پڑھتا رہتا ہوں آسانی کے پیش نظر۔

ادب کی ترویج کے لئے قائم حکومتی اداروں کی کارکردگی سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

دیکھیے حکومتی اداروں کا کام ایک محدود سے تناظر میں لگے بندھے معمولات سرانجام دینا ہوتا ہے۔ ان سے کسی انقلاب کی توقع رکھنا عبث ہے۔ جس طرح ہمارے دیگر حکومتی ادارے کام کرتے ہیں اسی طرح یہ ادارے بھی لگے ہوئے ہیں۔ ٹھیک ہی کام کر رہے ہوں گے۔

ارژنگ کے قارئین کے لئے کوئی پیغام؟

اپنے پیشے کو اپنا فن بنا لیجئے۔ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں لگن سے کام کرتی ہیں۔ مارٹن لوتھر کنگ نے اپنے ایک خطاب میں کہا تھا کہ اگر تمہارا کام کوچوں میں جھاڑو لگانا بھی ہے تو اسے ایسے انجام دو جیسے شیکسپیئر نظمیں کہتا تھا، بیتھوون موسیقی لکھتا تھا اور مائکل اینجلو مجسمے بناتا تھا۔ اگر اس مملکتِ خداداد کی ترقی کے خواب کو ہم نے حقیقت کا روپ دینا ہے تو محنت، لگن اور خوش نیتی سے کام کرنا ہوگا۔

مختصر ادبی خبریں

✦ معروف ادیبہ اور ادب لطیف کی مدیرہ صدیقہ بیگم گزشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

✦ کراچی میں مقیم نامور شاعر عارف شفیق گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

✦ راولپنڈی میں مقیم شاعر ارشد ملک کی والدہ گزشتہ دنوں خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

✦ نامور صحافی مدثر اقبال بٹ کے بھائی منظور حسین بٹ جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

✦ لاہور میں مقیم اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر عمران سلیم انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مرحوم کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

✦ بھکر میں مقیم شاعر مقبول ذکی کی والدہ قضائے الٰہی سے انتقال کر گئی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ احباب سے دعا کی درخواست ہے۔

✦ بارہویں عالمی اُردو کانفرنس کراچی آرٹس کونسل کے زیر اہتمام کراچی میں منعقد ہوئی جس میں پاکستان کے علاوہ دنیا بھر سے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں کراچی کی عوام کی دلچسپی بہت بھرپور رہی۔

✦ ڈنمارک میں مقیم معروف شاعر ظفر اعوان کے اعزاز میں پہچان انٹرنیشنل لاہور نے ایک شاندار محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت اعجاز توکل نے کی۔ میزبان حسن عباسی تھے۔

✦ ڈیرہ غازی خاں کے شاعر شیراز غفور کے اعزاز میں ادبی تنظیم قرطاس نے محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں نامور شعراء نے شرکت کی۔ صدارت باقی احمد پوری نے کی۔

✦ بلدیہ وہاڑی میں معروف شاعر ارشد شاہین کے نام ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت سلمان صدیق نے کی۔ اس تقریب میں کثیر تعداد میں شعراء اور عوام نے شرکت کی۔

✦ ''قائداعظم کے نظریاتی رفقاء'' کے عنوان سے اکیڈمی ادبیات اسلام آباد کے دفتر میں ایک مکالمے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت احسان اکبر نے کی۔ مہمانانِ خصوصی پروفیسر جلیل عالی اور محمد حمید شاہد تھے۔ ظہیر گیلانی اور ادریس آزاد نے کلیدی مقالات پیش کیے۔

✦ ادبی تنظیم ''زندہ لوگ'' کا پینتالیسواں اجلاس پروفیسر جلیل عالی کی رہائش گاہ پر منعقد کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت جناب افتخار عارف نے کی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نوازش، نسیم سحر، سعید راجا، ڈاکٹر فرحت عباس اور علی محمد فرشی نے شرکت کی۔

✦ اسلامی جمعیت طلبہ کے زیر اہتمام سیالکوٹ میں مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جسے عوام نے بہت پسند کیا۔

✦ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پنجابی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت انور مسعود نے اس مشاعرے میں نامور پنجابی شعراء نے شرکت کی۔

✦ کوپن ہیگن میں مقیم معروف شاعر عدیل احمد آسی کے پہلے نعتیہ مجموعے ''ذکر رسالت مآب ﷺ'' کی تقریب رونمائی کوپن ہیگن میں منعقد کی گئی جس میں یورپ بھر سے شعراء نے شرکت کی۔

✦ یومِ قائداعظم کے موقع پر مشاعرہ نذرِ قائد ۲۱ دسمبر کو اکادمی کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا۔ صدارت افتخار عارف نے کی۔

✦ بزمِ ریاض رومانی کا ماہانہ مشاعرہ سوسائٹی پبلک سکول مغل پورہ کی لائبریری میں منعقد کیا گیا۔

✦ بزمِ عامل کا ماہانہ مشاعرہ ادبی بیٹھک الحمراء لاہور میں منعقد ہوا۔

✦ ادارہ خیال وفن کے زیر اہتمام محمد ممتاز راشد لاہوری نے آسٹریلیا سے تشریف لائے ہوئے ماہر تعلیم اور ماہر اقبالیات افضل رضوی کی تالیف ''در بزرگِ لالہ وگل'' کی تقریب رونمائی منعقد کی۔

✦ بزمِ ریاض رحمانی خیر پور ٹامے والی کے زیر اہتمام ۱۵ روزہ طرحی مشاعرہ رہائش گاہ ریاض احمد رحمانی مرحوم منعقد ہوا۔

✦ اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر ظفر اعوان کے تیسرے پنجابی مجموعے ''کندھا اُتے گھاء'' کی تقریب رونمائی'' گزشتہ دنوں سیالکوٹ اور لاہور میں منعقد ہوئی۔

نامہ ہائے احباب

پیارے حسن عباسی صاحب سلامت رہو!

پیار و دعوات۔ 2019 سال ختم ہونے والا ہے۔ ارژنگ اپنی پوری آب و تاب سے ملتا رہتا ہے۔ جس کے لیے دل کی اتھاہ گہرائی سے شکر گزار ہوں۔ یہ سال بھی گزرنے والا ہے۔ سوچا کہ کافی غیر حاضری ہو چکی جس کی وجہ بیان کروں گی کہ نہ تو ہاتھ جلتا تھا۔ اب بہت افاقہ ہے۔ دو عدد غزلیں نومبر دسمبر کے رسالوں میں میری مراد ہے۔ یہ غزلیں ''ارژنگ'' کے لیے ارسال کرتی ہوں۔ اُمید ہے پذیرائی دے کر ہمیشہ کی طرح نوازیں گے۔

خلوص کیش/بسمل صابری، ساہیوال

ارژنگ سخن حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ارژنگ کا ٹائٹل حضرت علامہ اقبال کی خوش ادا تصویر سے پروقار ہے۔ ارژنگ وقت کا پابند ہے۔ دیدہ ور اور خوش قدم ہے۔ اس کے اسباب میں تنوع دل پذیر ہے۔ رسالہ ہاتھ آتے ہی ایک نشست میں پڑھ لیا جاتا ہے۔ شاعری کے حصے میں آپ اس ناچیز سے لاڈ پیار برتتے ہیں۔ یہ آپ کی مہربانی ہے میری غزل کے دوسرے شعر کا دوسرا مصرع اس طرح ہے: ع مجھ کو سقراط کی روداد بہت یاد آئی

اس میں لفظ روایت نہیں۔ جانے یہ کیسے در آیا۔ یہ ''اصلاح'' کس نے کی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے انٹرویو نے ارژنگ میں رنگ جمایا ہے۔ فی الواقع تجربے کی قوت کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں آپ ہمارے لیے گوناگوں دلچسپیاں پیدا کرتے ہیں۔

میاں چنوں کے ممبر اسمبلی کا شکریہ ان کی توجہ حاصل ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے۔

خیر اندیش/آصف ثاقب، بوئی ہزارہ

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

تسلیم۔ ''ارژنگ'' کی ماہانہ ترسیل کا شکریہ۔ نومبر کے شمارے میں میرے سلام کی اشاعت پر ممنون ہوں۔ البتہ ساتویں شعر کے بعد آٹھویں شعر کا صرف پہلا مصرعہ ہی چھپا ہے۔ مکمل شعر درج ذیل ہے:

صبر مظلوم کا نتیجہ ہے
ظلم کی تیغ اب نیام میں ہے

ایک تازہ حمد پیش خدمت ہے۔ کراچی سے جناب مسلم شمیم صاحب کا میرے شعری مجموعے ''اک دورِ محبت بیت گیا'' کے حوالے سے ایک مضمون ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ اسے ''ارژنگ'' کی زینت بنائیں گے۔ حمد و نعت کے حوالے سے نئی کتاب پر بات آئندہ ملاقات پر ہوگی۔ انشاءاللہ

خیر اندیش/مظفر حسن منصور

خوشاب

محترم عامر بن علی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا جریدہ ''ارژنگ'' خرید کر پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ ''ارژنگ'' کے لیے میں اپنی غزلیں اور نظم ارسال کر رہی ہوں۔ برائے مہربانی ایک صفحہ میرے لیے بھی مختص کر کے میری غزلیں اور نظم شائع کر دیں۔ جس شمارے میں بھی شائع ہوں اس کی ایک کاپی مجھے ارسال کر دیں۔

ڈاکٹر غزالہ خاکوانی، ملتان

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

آداب۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ گزشتہ مہینے ارژنگ کا شمارہ موصول ہوا۔ انتہائی معیاری مواد پر مبنی شمارہ کہ جس کے تمام مضامین، افسانے اور شاعری پڑھنے کے لائق تھی۔ اس خوبصورت ادبی گلدستے کی ترتیب میں آپ کی محنت و کاوش جھلکتی تھی۔ مضامین بہت اچھے منتخب کر کے شامل کیے گئے تھے۔ خاص طور پر ناصر عباس نیر صاحب کا مضمون خاص اہمیت کا حامل تھا۔ شاعری اور افسانے بھی پڑھ کر بہت لطف حاصل ہوا۔

اس مرتبہ ایک غزل اور ایک افسانہ آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اگر قابل اشاعت ہوں تو آئندہ رسالے میں شامل کر کے ممنون فرمائیں۔

والسلام نیاز مند/اسلم سحاب ہاشمی، ساہیوال

جناب عامر بن علی صاحب!

جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ الحمد خیریت موجود خیریت مطلوب میں عموماً فیس بک استعمال نہیں کرتا۔ گزشتہ ہفتے ماہنامہ ''ارژنگ'' کے حوالے سے فیس بک پر پڑھا۔ سرورق دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آپ ایک خوبصورت ادبی مجلّہ شائع کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا نے پرنٹ میڈیا کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ لکھنے والے اب فیس بک، ٹویٹر اور واٹس ایپ کے ذریعے اپنی تخلیقات مع تصاویر فوراً دنیا تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان حالات میں ادبی مجلّہ شائع کرنا نہایت قابل تحسین کارنامہ ہے کہ جہاں ادب لوگوں کی ترجیحات میں ہی نہ ہوں۔

میں اپنے بارے میں تھوڑا بتاتا چلوں۔ مجھے لکھتے ہوئے ۲۰ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ مختلف اخبارات، رسائل و جرائد میں لکھتا رہا ہوں اور لکھ رہا ہوں۔ ''ارژنگ'' کے لیے بھی لکھنے کا خواہش مند ہوں۔ گزارش یہ تھی کہ مجھے ''ارژنگ'' کے گزشتہ ایک دو شمارے اگر ارسال کر دیں تو مطالعہ کے بعد میں مجلّے کے لیے تحریریں بھیج سکوں۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

رانا محمد شاہد، بورے والہ

development in children.

Everything suffers; tourism, recreation, business, the health of humans, animals, fish, and birds because of plastic pollution. The financial damage continuously being inflicted is inestimable.

Each picture has two sides, When Alexandar Parkes first introduced the plastic bags to the world he did not know it will harm the society in this way and he did not know 9 lac families of Pakistan will be dependant on the plastic bags industry for their livelihood. Before banning the plastic bags the Government must provide a source of livelihood to these people. The government must provide the resources and guidelines regarding the processing of biodegradable bags. We will eat to carry healthy food in our houses and eat healthy foods and will stay healthy.

❁❁❁

case of handwashing, which is more common in developing counties, but the effects could be significant there as well.

Toxic chemicals leach out of plastic and are found in the blood and tissue of nearly all of us. Exposure to them is linked to cancers, birth defects, impaired immunity, endocrine disruption, and other ailments. Wildlife becomes entangled in plastic, they eat it or mistake it for food and feed it to their young, and it is found littered in even extremely remote areas of the Earth.

Scientists have found microplastics in 114 marine species, and almost one-third of these end up on our plates. Some of the chemicals added to plastic to increase its performance are considered endocrine disruptors?-? chemicals that affect normal hormone function?-?while some retardants may interfere with brain

80% and 90% of the plastic particles contained in sewage, such as from garment fibers, persist in the sludge, says the study. Sewage sludge is often applied to fields as fertilizer, meaning that several thousand tons of microplastics end up in our soils each year.

Moreover, the surfaces of tiny fragments of plastic may carry disease-causing organisms and act as a vector for diseases in the environment. Microplastics can also interact with soil fauna, affecting their health and soil functions. "Earthworms, for example, make their burrows differently when microplastics are present in the soil, affecting the earthworm's fitness and the soil condition."

According to recent studies, more than 700,000 microscopic plastic fibers could be released into the environment during each cycle of a washing machine. This has not yet been studied in the

Good Bye Plastic Bags

Palwasha Safdar

Student of MPhil Microbiology UAF (Batch 2018-2020)

ARTICLE SUPERVISED BY: ASSISTANT PROFESSOR DR MUHAMMAD ASHRAF

INSTITUTE OF MICROBIOLOGY UNIVERSITY OF AGRICULTURE FAISALABAD

discard every day is recycled or incinerated in waste-to-energy facilities. Much of it ends up in landfills, where it may take up to 1,000 years to decompose, leaching potentially toxic substances into the soil and water. Researchers in Germany are warning that the impact of microplastics in soils, sediments, and freshwater could have a long-term negative effect on such ecosystems.

Researchers say terrestrial microplastic pollution is much higher than marine microplastic pollution?-?estimated at four to 23 times higher, depending on the environment.

Sewage is an important factor in the distribution of microplastics. In fact, between be used and fewer animals will be killed.

Plastic bags have made our life easier but unfortunately, it is not disposed of properly. We see them blowing around in the streets and they often end up in oceans and seas and drastically effecting half of marine life. Plastic does not biodegrade.

When plastic bags are thrown on land it makes the soil less fertile. Plastic bags do not dissolve, they break into tiny pieces and remain for up to 1000 years contaminating soil waterways and oceans. When plastic is burned they release toxic chemicals that are deposited in soil and surface water and on plants.

Very little of the plastic we

While swiping my fingers on social apps I read reactions of people about the 'Lifafa band' movement of the government. Our Prime Minister is too much concerned about environmental sustainability then we should become a better citizen by eliminating the single piece of the plastic bag from our environment.

Plastic bags are made up of polythene which causes pollution from manufacturing to disposal. Its production uses up 8% of soil resources and its manufacturing is harmful to the environment. Bringing paper bags as a convenience while shopping will drastically decrease plastic bag pollution. Fewer bags will be produced and less petroleum will

میں سمجھتا ہوں کہ ایک جینوئن تخلیق کار صرف تخلیق کرتا ہے اور اس کے نظریات اخذ کرنا نقادوں کا کام ہے

منفرد شاعر اور ادیب

حسنین سحر

سے حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی گفتگو

بڑا شاعر وہ ہے جو اپنے اندر کی آواز پر لبیک کہتا ہے

خالد احمد کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں صرف نم ہے جو عطا بھی انہی کی ہے

اپنی ابتدائی زندگی اور خاندانی پس منظر سے متعلق کچھ بتائیں۔

ابتدائی زندگی پاکستان کے مختلف شہروں میں گھومتے گزری کہ والد صاحب پاک فوج سے وابستہ تھے۔1985 میں والد صاحب نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی جس کے بعد لاہور میں قیام مستقل ہوگیا۔ میٹرک لاہور سے ہی کیا جس کے بعد گورنمنٹ کالج اور ہیلی کالج سے ہوتے ہوئے فرگوسن سے چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا امتحان پاس کیا۔ خاندانی پس منظر کچھ یوں ہے کہ قوم قانوں گو شیخ ہے جس کی رو سے برادری علامہ اقبال سے ملتی ہے، علامہ کے دوست سر عبدالقادر میرے والد کے نانا تھے۔ دادا مرحوم محمد حسین عالمگیر ایڈووکیٹ تھے اور بعد ازاں لکھنے پڑھنے سے وابستہ رہے؛ خاص طور پر قرآن کی تفسیر پر ان کا کافی کام موجود ہے۔ ان کے مخطوطے برادرم شاہد ماکلی نے مدون کیے ہیں جو کہ عنقریب "گلدستہ انوار" کے نام سے شائع ہوں گے انشااللہ۔

ادب کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

کچھ تو خون نے شروع ہی سے زور مار رکھا تھا، پھر بچپن میں نانا مرحوم شیخ محمد سعید کے ساتھ بہت وقت گزرا جو اقبال کے حافظ تھے۔ ان کی شام ایک گھنٹہ چہل قدمی کی عادت تھی جس دوران وہ اقبال و غالب کے شعر سناتے رہتے۔ اس ایک گھنٹے میں میں ادب کی دنیا میں مسحور رہتا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے معلوم ہوتا چلا گیا کہ یہی میری دنیا ہے۔

آپ کا نظریہ شعر کیا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ ایک جینوئن تخلیق کار صرف تخلیق کرتا ہے اور اس کے نظریات اخذ کرنا نقادوں کا کام ہے۔ ہاں ایک نکتہ نظر ہر شاعر رکھتا ہے جو بس اسی کے لئے مختص ہوتا ہے۔ میرا نکتہ نظر شعر کے متعلق یہ ہے کہ جب تک خیال اور فن کا ایک توازن قائم نہیں ہوگا ایک بامعنی شعر ظہور پزیر نہیں ہوسکتا۔ یہ توازن ایک جمال میں ڈھل جاتا ہے جس کے بغیر شاعری یا کوئی بھی تخلیق اپنا مقصد پورا نہیں کرسکتی؛

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

معروف شاعر، مقبول کالم نگار اور منفرد مترجم و مدیر اعلیٰ ارژنگ

عامر بن علی

شائع ہو گیا

کی منتخب شاعری کا انگریزی و روسی زبان میں ترجمہ

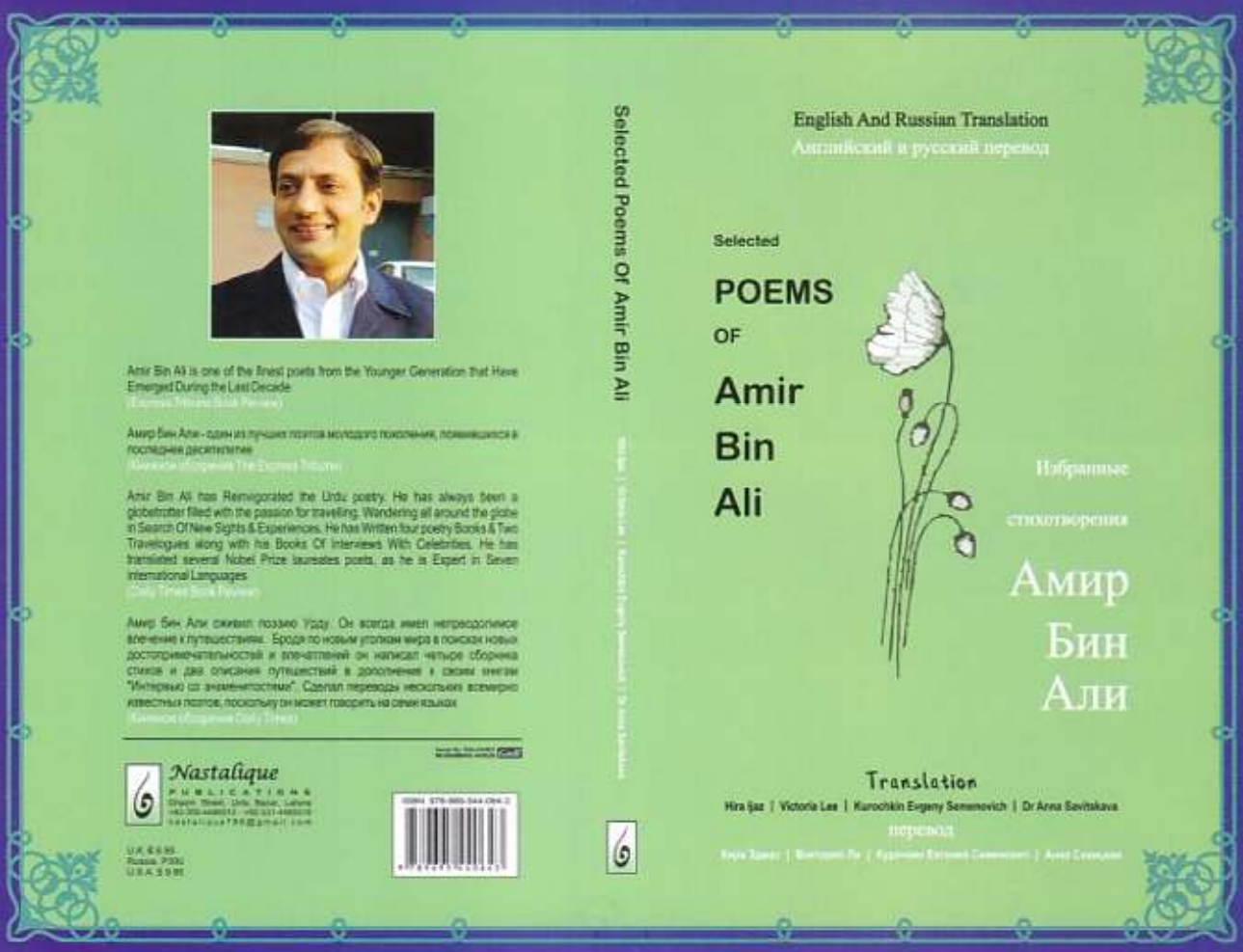

پاکستان کے اہم کتب خانوں کے علاوہ ای۔کامرس کی تمام اہم عالمی ویب سائٹس پر دستیاب ہے۔

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

تعارفی قیمت بمہ ڈاک خرچ

1000 روپے

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

Design By: 0300-4529521
MUHAMMAD AHSUN Gull

نستعلیق
Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com

Design By: 0300-4529521
MUHAMMAD AHSUN Gull